جامع المناہج والاسالیب



خواجہ عبد العظیم احمد

ادارہ الفضل آن لائن لندن



جامع المناهج والاساليب

مضمون نگار: خواجہ عبدالعظیم احمد

مرتبہ: فضل عمر شاہد

ادارہ الفضل آن لائن لندن

رابطہ کرنے کے لیے

ویب سائٹ: www.alfazlonline.org

ای میل ایڈریس: info@alfazlonline.org

editor@alfazlonline.org

فون نمبر: +44 79 51 614020

+44 73 76 159966

آن لائن ایڈیشن



حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانیؓ

پیش لفظ

الحمد للہ ثم الحمد للہ۔ ادارہ الفضل آن لائن کو آج مؤرخہ 22 نومبر 2022ء کو 15 ویں کتاب جامع المناھج والاسالیب کو دنیا بھر میں سر کولیٹ کرنے کی توفیق مل رہی ہے۔ قارئین کے علم میں ہے کہ الفضل آن لائن میں قسط وار شائع ہونے والے مضامین کو (اول) ادارہ لنکس کے اعتبار سے تمام اقساط کو اکٹھا کرکے اپنے قارئین کو مہیا کر دیتا ہے اور (دوم) اس کی PDF تیار کر کے کتابی شکل دے کر on-air کر دی جاتی ہیں اور پیارے حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کے ایک ارشاد پر الفضل آن لائن کی ویب سائٹ www.alfazlonline.org پر چڑھا دی جاتی ہیں تا قارئین آسانی کے ساتھ پڑھ بھی سکیں، پرنٹ کرانے کی ضرورت ہو تو بآسانی پرنٹ کروا کر محفوظ کر لی جائے اور یوں دنیا بھر کے قارئین میں یہ کتب بہت مقبولیت کا درجہ پا رہی ہیں۔ الحمد للہ۔

اس موقع پر جہاں اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرنا فرض بنتا ہے وہاں ہم اپنے پیارے امام ایدہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔ جن کی رہنمائی میں خاکسار نے اپنی ٹیم کے ممبران کے تعاون سے 10 جون 2022ء سے 22 نومبر 2022ء تک 6 ماہ کے عرصہ سے بھی کم عرصہ میں 15 ضخیم کتب منظر عام پر لانے کی توفیق پائی۔ الحمدللہ رب العالمین۔

زیر نظر کتاب جامع المناھج و الاسالیب 10 قسطوں میں الفضل آن لائن کی زینت بنی جس کے مصنف علامہ خواجہ عبد العظیم احمد صاحب پرنسپل جامعہ احمدیہ نائجیریاہیں۔ آپ نے

نہایت خوبصورتی اور علمی لحاظ سے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی تحریر کردہ تفسیر کبیر کو جامع المناھج ثابت کیا ہے۔ مصنف کتاب ہٰذا جامعہ میں ترجمۃ القرآن و تفسیر کے استاد بھی ہیں ۔آپ نے مختلف علماء کی تفاسیر کے مطالعہ کے دوران مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کی تفسیر القرآن کے حوالے سے کسی کا یہ قول پڑھا کہ یہ تفسیر جامع المناھج ہے۔ اس پر آپ کے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ جامع المناھج تو وہ تفسیر ہو سکتی ہے جو وحی و الہام کے پانی سے سیراب ہو اس سلسلہ میں آپ نے جماعت احمدیہ کی تفسیر کبیر کا مطالعہ کیا اور آپ نے اپنی 10 قسطوں میں تفسیر کبیر کو جامع المناھج ہر لحاظ سے ثابت کیا۔

آنجناب نے اپنا یہ مضمون خاکسار کو بھجوایا اور سرسری سی نگاہ خاکسار نے جب اس مضمون پر ڈالی تو مجھے یہ مضمون خاصا ثقیل معلوم ہوا اور اس سوچ میں گم ہو گیا کہ الفضل کے قاری کیا اس ثقیل مضمون سے فائدہ اٹھا پائیں گے یا نہیں۔ چونکہ مضمون علمی تھا اس لئے قارئین کے استفادہ کے لئے خاکسار نے اس کو الفضل کا حصہ بنانے کا فیصلہ کر لیا اور اڑھائی ماہ ہر منگل کو یہ منظر عام پر آنے لگا۔ تو ایک بار پھر بڑی شان سے احباب جماعت کی اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم، اس کی تفسیر سے پیار و عشق اور خلیفۃ المسیح سے اپنی محبت کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جب قارئین الفضل نے اس مضمون کو بہت پسند کیا۔ اپنے خطوط و تبصروں میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کو دعاؤں کے گلدستے پیش کیے اور تفسیر کبیر کے ساتھ اپنی محبت کو ثابت کیا۔ بلکہ ایک دوست نے تو مضمون نگار کو داد پیش کی کہ انہوں نے کمال حکمت اور احسن طریق پر دنیا بھر میں پائی جانے والی تفاسیر پر تفسیر کبیر کی فوقیت ہر لحاظ سے ثابت کر دی۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ۔

امید ہے یہ کتاب بھی سابقہ کتب کی طرح بہت سوں کے علم و تقویٰ میں نکھار پیدا

کرنے کا موجب ہو گی۔ اللہ تعالیٰ مکرم فضل عمر شاہد آف لٹویا کو جزائے خیر عطا فرمائے جو یہ مائدہ کتابی صورت میں پیش کرنے جا رہے ہیں اور ان بیسیوں پوشیدہ کارکنان کے لئے جزاھم اللہ خیراً اور کان اللہ معھم کی دعائیں ہیں جنہوں نے پردہ کے پیچھے رہ کر اس مائدہ کے لئے کام کیا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کو جزائے خیر عطا کرے۔ آمین

حنیف محمود

ایڈیٹر روزنامہ الفضل آن لائن

22-11-2022

فہرست مضامین

قسط 1
ابتدائیہ جامع المناھج والاسالیب

قرآن مجید فرقان حمید کی تفسیر و تشریح کا مبارک آغاز تو حضور نبی کریمؐ کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی۔ آپؐ کاتبین وحی میں سے کسی کو بلاتے اور وہ آیت لکھوا لیتے۔ پھر بعد میں اس کی تعلیم اپنے متبعین کو دیتے۔ بعض اوقات تو کسی سورت یا آیت کے نزول کے وقت بکثرت ملائکہ کا نزول ہوتا جو آپؐ کو اس کے معارف و نکات سے مطلع کرتے۔ امام ابن کثیر الطبرانی الصغیر کے حوالہ سے اپنی تفسیر میں ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ جب سورت الانعام کا نزول ہوا تو اس وقت ستر ہزار ملائکہ اس کے ساتھ نازل ہوئے۔

(تفسیر القرآن العظیم، لامام ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ1057 مطبوعہ دار ابن الہیثم۔ قاہرہ)

ان معارف کے نزول کے بعد آپؐ ان کی تبلیغ کا فرض سرانجام دیتے۔ جب صحابہ میں سے کسی کو کسی مقام قرآن کی سمجھ نہ آتی تو وہ آنحضورؐ سے اس کی معرفت پوچھ بھی لیتے۔ اس کام کے لئے آپ نے چار قرّاء کو خاص طور پر چنا ہوا تھا۔ جن میں سے دو مہاجر اور دو انصاری صحابہ تھے۔ یعنی حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اس دور میں ان معروف صحابہ میں سے جنہوں نے علم التفسیر میں ایک نمایاں مقام و مرتبہ حاصل کیا ان میں حضرات خلفاء راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ

عنہم اجمعین شامل ہیں۔

اس دور کے صحابہ کے میدان تفسیر میں مجاہدات کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ مثلاً مکہ معظّمہ، مدینہ، بصرہ، شام اور کوفہ کے اسلامی مراکز میں تفسیر کے میدان میں کافی کام ہوا۔ صحابہ کے شاگردوں کی جماعتیں تیار ہوئیں جنہوں نے آگے چل کر کتب مدوّن کیں۔ اس سلسلہ میں حدیث، تاریخ، تفسیر اور سیرت کی بنیادی اور اول ین باقاعدہ کتب کے حوالہ سے امام محمد بن جعفر الکتانی اپنی تصنیف ''الرسالۃ المستطرفۃ'' میں ایک اساسی اہمیت کی حامل بات لکھتے ہیں کہ:

''سو پہلی (باقاعدہ) تصنیف اس ضمن میں جو مکہ میں لکھی گئی ابن جریج کی ہے، اس میں آثار صحابہ اور کچھ تفسیر ی نکات جو عطاء، مجاہد اور ان کے علاوہ حضرت ابن عباس کے تلامذہ سے مروی تھے موجود تھے۔اس کے بعد یمن میں معمر بن راشد یمانی کی کتاب تھی جن میں سنن تھیں۔ پھر مؤطا تھی۔ اس کے بعد سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ کی جوامع تھیں جن میں آثار و تفسیر کے نکات تھے۔ یہ پانچ کتابیں اوائل اسلام میں باقاعدہ طور پر تصنیف کی گئیں۔''

(بحوالہ الرسالۃ المستطرفۃ صفحہ 9 الطبعۃ الخامسۃ دار البشائر الاسلامیۃ، بیروت لبنان 1993ء)

ابن جریج (ولادت:80ھ - وفات: 150ھ) کی اس تفسیر کا تذکرہ تاریخ میں بھی ملتا ہے۔

(بحوالہ ھدیۃ العارفین اسماء المؤلفین وآثار المصنفین طبعۃ دار احیاء التراث العربی جلد اول صفحہ 623)

ایسے ہی سفیان بن عیینہ (ولادت:107ھ - وفات:197ھ) کی مرتب کردہ ایک تفسیر "تفسیر سفیان بن عیینہ" بھی موجود ہے۔جس کو تحقیق کے بعد احمد صالح محایری نے المکتب الاسلامی سے شائع کیا۔

سو معلوم ہوا کہ یہ بابرکت کام دور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں ہی شروع ہو کر اپنی ابتدائی منازل طے کرنے لگ پڑا تھا۔

تفسیر کو بنیادی طور پر دو اقسام میں منقسم کیا جاتا ہے۔

1۔ تفسیر بالماثور
2۔ تفسیر بالرائے

تفسیر بالماثور

پروفیسر محمد علی الصابونی، مدرس مسجد نبوی صاحب تفسیر صفوۃ التفاسیر اپنی ایک کتاب "التبیان فی علوم القرآن" میں اس کو "تفسیر بالروایۃ۔۔۔تفسیر بالنقل" لکھتے ہیں۔

(التبیان فی علوم القرآن صفحہ 75، مطبوعہ دار عمر بن الخطاب)

اس قسم کی تفسیر کو اردو میں اثری یا نقلی بھی کہتے ہیں۔

معروف مصری عالم پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین الذہبی (المتوفّٰی 1977ء) کے نزدیک تفسیر بالماثور کے بنیادی ماخذ چار ہیں، آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ، آثار صحابہ اور اقوال تابعین۔

(التفسیر والمفسرون، جلد اول صفحہ 137 مطبوعہ دار الحدیث القاہرہ 2012ء)

تفسیر بالرائے

تفسیر بالرائے سے مراد علم و عقل، تدبر و تفکیر اور اجتہاد کر کے قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنا اور قرآنی منطوق سمجھ کر، قرآن ہی کے دوسرے مقامات کی مدد سے اس کو کھولنا اور اس کو بتشریح بیان کرنا ہے۔

مفسرین نے اس کی دو مزید اقسام بیان کی ہیں۔ التفسیر بالرای المحمود اور التفسیر بالرای المذموم۔

پہلی قسم یعنی التفسیر بالرای المحمود کا مطلب یہ ہے کہ ایسی تفسیر جو قرآنی ہدایت، سنت و تعلیمات نبویہ، قرآنی منطوق، شریعت اسلامی اور اسلامی تشخص کے برخلاف نہ ہو اور دوسری قسم یعنی التفسیر بالرای المذموم وہ ہے جو اس کے اُلٹ ہو۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ عن ابن عباسٍ، عن النبی ﷺ، قال: من قال فی القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النارِ یعنی جس نے بھی قرآن سے متعلق کوئی بات اپنی آراء کی بنیاد پر کی تو گویا اس نے آگ میں اپنا ٹھکانہ بنایا۔

(بحوالہ سنن الترمذی کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللّٰہ
باب ماجآء فی الذی یفسّر القرآن برایہ حدیث نمبر 2951)

اس پر وشنی ڈالتے ہوئے مولانا ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں۔

"تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوتی ہیں، تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے، کیونکہ

اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہوجائے گا، حالانکہ خود قرآن کا یہ حال ہے کہ اول سے لیکر آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (محمد:25) در اصل تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ رائے مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے، جو اس لئے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے، بلکہ اس لئے کی جائے کہ ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جب باب عقائد میں ردو کد شروع ہوئی تو مختلف مذاہب کلامیہ پیدا ہو گئے، ہر مذہب کے مناظر نے چاہا اپنے مذہب پر نصوص قرآنیہ کوڈھالے، وہ اس کی جستجو میں نہ تھے کہ قرآن کیا کہتا ہے، بلکہ ساری کاوش اس کی تھی کہ کسی طرح اسے اپنے مذہب کا مؤید دکھلا دیں، اس طرح کی تفسیر بالرائے تھی۔"

(بحوالہ تفسیر ترجمان القرآن جلد اول صفحہ 51، 52 مطبوعہ اسلامی اکیڈمی لاہور)

التفسیر بالرای المحمود کی ذیل میں معروف مصری عالم پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین الذہبی (المتوفّٰی 1977ء) نے چند ایک تفاسیر گنوائی ہیں، جن میں امام فخر الدین الرازی کی مفاتیح الغیب، بیضاوی کی انوار التنزیل و اسرار التاویل، نسفی کی مدارك التنزیل و حقائق التاویل، خازن کی لباب التاویل فی معانی التنزیل، ابو حیان الاندلسی کی البحر المحیط اور امام محمود الآلوسی کی روح المعانی وغیرہ

(بحوالہ التفسیر والمفسرون جلد اول ماخوذ صفحہ 247 - 300
مطبوعہ دار الحدیث القاہرہ سن 2012ء)

التفسیر بالرای المذموم میں وہ کیا صورتیں ہو سکتیں ہیں جن سے اس کی مناہی آئی ہے؟

اس سلسلہ میں پہلی صورت تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر پختہ علم کے کوئی بات اپنی طرف سے بنا کر قرآن کی تفسیر کے طور پر پیش کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن کے متشابہ مقامات کو اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے بغیر از خود کھولنے کی کوشش کرنا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ان کلمات قرآنیہ کو جن کو شرعی معانی میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج وغیرہ ان کو لغوی معانی میں استعمال کر کے تفسیر کی جائے۔چوتھی صورت یہ ہو گی کہ اگر کوئی قرآن شریف کی دوسری آیات و تعلیمات، آنحضرتؐ کی ثابت شدہ ہدایات، آثارِ صحابہ کے برخلاف کوئی مؤقف اپنائے یا کسی قطعی اور متفق اور ثابت شدہ تفسیری نکتہ کے بر خلاف مؤقف اپنایا جائے۔ پانچویں صورت یہ ہے کہ اگر کوئی قرآن کو اپنی رائے کے تابع کرنے کی کوشش کرے۔ یہ چند ایک صورتیں خلاصۃً بیان کی گئی ہیں، جو کہ مفسرین نے مذموم رائے والی تفسیر کے حوالہ سے بیان کی ہیں۔ ان تفاسیر میں پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین الذہبی (المتوفّٰی 1977ء) معتزلہ، شیعہ، بابی اور بہائی تفاسیر کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(بحوالہ التفسیر والمفسرون جلد اول و دوم مطبوعہ دار الحدیث القاہرہ سن 2012ء)

تفاسیر القرآن میں اخذ کردہ مناہج واسالیب

ہر تفسیر کا ایک خاص منہج ہوتا ہے، وہ راستہ جو مفسر اپنے لئے چنتا ہے۔ اس راستہ کی

پیروی کرتے ہوئے مفسر اپنے ہدف کو پاتا ہے۔ اس کو اردو میں تفسیری رجحان بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی اگر مفسر ماہر لغت ہے تو وہ رنگ اس کی تفسیر میں بارہا نظر آئے گا۔ اگر مفسر صوفی ہے تو اس کی تفسیر میں صوفیانہ پن نظر آئے گا۔

ان تفسیری رجحانات کے بارہ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفیٰ 1762ء) اپنی شہرہ آفاق کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں سات رجحانات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "یہ بھی جاننا چاہیئے کہ مفسرین اپنے مباحث اور تفسیری اسالیب کے اختلاف کی وجہ سے مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ قرآنی آیات سے موافق مرفوع اورموقوف احادیث ڈھونڈ کر لاتے ہیں، یا اقوال تابعین اور اسرائیلی روایات۔یہ رجحان محدثین کی تفسیر میں پایا جاتا ہے۔ان میں سے دوسرا گروہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی تاویل کرتے ہیں اور وہ جو ان کے مذہب تنزیہہ سے موافق نہ ہو تو اس کو ظاہری معنیٰ سے ہٹا دیتے ہیں۔ اس سے وہ پھر مخالفین (قرآن) کی ادلہ کا رد بعض آیات سے کرتے ہیں۔ یہ انداز متکلمین کا ہے۔ ان میں ایک گروہ وہ ہے جو آیات قرآنیہ سے فقہی احکامات کا استخراج و استنباط کرتے ہیں اور بعض اجتہادات کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں اور مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔ یہ طریق تفسیر فقہاء کا ہے اور ان میں سے ایک چوتھا گروہ ہے جو قرآن کی نحو اور اس کی لغت پر بحث کرتا ہے۔اور ہر موضوع پر عرب کے کلام سے شواہد پیش کرتے ہیں۔ یہ منہج ماہرین لغت اور نحویوں کا ہے۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو قرآن کے نکات علم المعانی والبیان کی قبیل سے نکالتے ہیں اور کلام پاک کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ رجحان ادباء اور میدان بلاغت کے علماء کا ہے اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ماہرین فن قراء اور علماء سے مروی قرآت کو بیان کرتے ہیں اور اس مجال

میں ہر قسم کی کوشش اور محنت کرتے ہیں۔ یہ اسلوب مفسرین میں سے قرّاء کا ہے اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو علمِ سلوک اور علمِ حقائق سے متعلق معارف کا بیان کرتے ہیں اور یہ منہج صوفیاء کا ہے۔"

(بحوالہ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر صفحہ 92، 93 مطبوعہ بیت العلم کراچی 2006ء)

مشہور تفسیری مناھج و اسالیب
اور تفسیر کبیر کی جامعیت

1۔ اثری منہج/ تفسیر بالماثور/ محدثانہ رجحان

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم سب سے پہلے نبی رحمت حضرت اقدس محمد مصطفیؐ کو خود سکھایا تھا اور اس کے مندرجات سے باخبر کیا تھا، اس لئے قرآن کے پہلے مفسر آنحضرتؐ خود تھے۔ آپ نے جس انداز میں صحابہ کرام کو قرآن سکھایا اور اس کی تشریح فرمائی، ان روایات کو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین نے محدثین و شارحین قرآن تک پہنچایا۔ اس طرح آیات قرآنیہ سے متعلق تشریحی احادیث ہم تک پہنچیں۔ اسی منہج کو اثری منہج یا تفسیر بالماثور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر میں مندرجہ ذیل معروف ہیں۔

- جامع البیان فی تفسیر القرآن لابن جریر الطبری (224ھ تا 310ھ)
- معالم التنزیل لابی محمد الحسین البغوی (433ھ تا 516ھ)
- تفسیر القرآن العظیم لابی الفداء الحافظ ابن کثیر (701ھ تا 774ھ)

- الدر المنثور لجلال الدین السیوطی (849ھ تا 911ھ)
- اور برصغیر پاک و ہند میں اسی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر میں مندرجہ ذیل مشہور ہیں۔
- ترجمان القرآن (اردو) از نواب صدیق حسن خان (1832ء – 1890ء)
- فتح البیان (عربی) از نواب صدیق حسن خان قنوجی (1832ء – 1890ء)
- تفسیر احسن التفاسیر از سید احمد حسن محدث دہلوی (1850ء – 1912ء)
- مواہب الرحمٰن از سید امیر علی ملیح آبادی (1849ء – 1928ء)

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اثری تفسیر میں محدث مفسرین مرفوع اور موقوف احادیث کے ذریعہ سے تفسیر کرتے ہیں۔ یا پھر کسی اسرائیلی روایت کا ذکر کر کے اس حصہ قرآن کی تفسیر کرتے ہیں۔

تفسیر کبیر میں اثری منہج کی چند مثالیں

آپ سورت الفرقان کی آیت 76 کی تفسیر میں فرماتے ہیں، (حوالہ درج کرنے سے قبل آیت کا متن دیا جا رہا ہے)

أُولَٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا

”پھر غُرْفَة کے ایک معنے جیسا کہ حل لغات میں (اَلْغُرْفَةُ: اس کے معنے ہیں اَلسَّمَآءُ السَّابِعَةُ۔

اقرب) بتایا جا چکا ہے ساتویں آسمان کے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ عبادالرحمٰن جنہوں نے دنیا میں انکسار اور عدل و انصاف کے ساتھ اپنی عمر بسر کی۔ جو دن کے اوقات میں بھی احکام الٰہی کے تابع رہے اور رات کی تاریکیوں میں بھی سجدہ و قیام میں اللہ تعالیٰ کے حضور گڑ گڑاتے اور دعائیں کرتے رہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرتے ہوئے انہیں ساتویں آسمان پر جگہ عنایت فرمائے گا یعنی وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ رکھے جائیں گے۔ کیونکہ حضرت ابراہیمؑ ساتویں آسمان پر ہی ہیں۔ (مسند احمد بن حنبل جلد4 صفحہ207 – 209) اس کی طرف رسول کریمؐ نے اس حدیث میں بھی اشارہ فرمایا ہے کہ إذا تواضع العبد رفعه اللّٰه إلى السماء السابعة (کنزالعمال جلد2 صفحہ25) کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ساتویں آسمان میں جگہ دیتا ہے۔ چونکہ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کے لئے ھون اور تذلّل اختیار کیا ہو گا اس لئے خدا تعالیٰ بھی انہیں سب سے اونچا مقام رفعت عطا فرمائے گا۔اور انہیں منازل قرب میں سے سب سے اونچی منزل عطا کی جائے گی۔"

(تفسیر کبیر جلد ششم صفحہ597 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

آپ سورۃ البقرہ کی آیت 274 کی تفسیر میں فرماتے ہیں، (حوالہ درج کرنے سے قبل آیت کا متن دیا جا رہا ہے)

لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِیۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ ۫ یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعۡرِفُهُمۡ بِسِیۡمٰهُمۡ ۚ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ

"لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا کے یہ معنے نہیں کہ وہ سوال تو کرتے ہیں مگر لوگوں سے چمٹ کر نہیں صرف نرمی سے مانگ لیتے ہیں۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ لوگوں سے سوال

ہی نہیں کرتے۔ گویا اِلحَاف سوال کو مقید کرنے کے لئے نہیں بلکہ سوال کی شناعت بیان کرنے کے لئے ہے۔ یعنی وہ اِلحَاف نہیں کر سکتے کیونکہ اِلحَاف چاہتا ہے کہ انسان دائماً مسئول عنہ کے ساتھ لگا رہے اور وہ خدا کے لئے وقف ہو چکے ہیں۔ پس وہ اپنی غربت چھپانے کے لئے امراء کا سایہ بننے سے بھی گریز کرتے ہیں اور اس طرح دوسرے لوگوں سے جو سوالِ مجسم بن کر انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے اس سے بھی محروم رہتے ہیں۔ گویا یہ الفاظ بطور تفسیر ہیں نہ کہ بطور قید۔ خود رسول کریمؐ سے بھی یہی معنیٰ ثابت ہیں۔ چنانچہ رسول کریمؐ فرماتے ہیں۔ لَیۡسَ الۡمِسۡکِینُ الَّذِی تَرُدُّہُ التَّمۡرَۃُ وَالتَّمۡرَتَانِ، ولَا اللُّقۡمَۃُ وَاللُّقۡمَتَانِ انّمَا الۡمِسۡکِینُ الذِی یَتَعَفَّفُ اقرءوا اِن شئتم لَا یَسۡأَلُونَ النَّاسَ اِلۡحَافًا (بخاری کتاب التفسیر) یعنی مسکین وہ نہیں جسے ایک یا دو کھجوریں یا ایک لقمہ یا دو لقمے دے دیں۔ بلکہ مسکین وہ ہے جو سوال ہی نہیں کرتا۔ یہ اِلحَاف کی رسول کریمؐ نے خود تفسیر بیان فرمائی ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے۔ لَیۡسَ الۡمِسۡکِینُ الَّذِی یَطُوفُ عَلَی النَّاسِ تَرُدُّہُ اللُّقۡمَۃُ وَاللُّقۡمَتَانِ وَالتَّمۡرَۃُ وَالتَّمۡرَتَانِ وَلَکِنِ الۡمِسۡکِینُ الَّذِی لَا یَجِدُ غِنًی یُغۡنِیۡهِ وَلَا یُفۡطَنُ بِهِ فَیُتَصَدَّقُ عَلَیۡهِ وَلَا یَقُومُ فَیَسۡأَلُ النَّاسَ۔ (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قول اللہ عزّ و جلّ لَا یَسۡأَلُونَ النَّاسَ اِلۡحَافًا) یعنی مسکین وہ نہیں جو لوگوں سے مانگتا پھرتا ہے اور اسے ایک دو لقمے یا ایک دو کھجوریں مل جاتی ہیں بلکہ مسکین وہ ہے جس کے پاس کوئی مال نہ ہو اور نہ لوگوں کو اس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ اسے صدقہ ہی دے دیں اور نہ ہی وہ لوگوں سے سوال کر کے اپنی حاجت پوری کرے۔اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسکین دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو لوگوں سے سوال کرتے پھرتے ہیں اور انہیں دوسروں سے مانگنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ دوسرے وہ جو لوگوں سے مانگتے نہیں بلکہ کام کر کے روزی کماتے ہیں۔ لیکن

ان کی آمد اس قدر کم ہوتی ہے کہ وہ بھی قابل امداد ہوتے ہیں۔ بہر حال احادیث میں سوال کرنے سے سخت روکا گیا ہے اور سوائے تین آدمیوں کے اور کسی کے لئے سوال کرنا جائز نہیں سمجھا گیا۔چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لَا تَصْلُحُ إِلَّا لِثَلَاثَةٍ لِذِی فَقْرٍ مُدْقِعٍ اَوْ لِذِی غُرْمٍ مُفْظِعٍ اَوْ لِذِی دَمٍ مُوجِعٍ (مشکوٰۃ المصابیح) یعنی تین آدمیوں کے سوا اور کسی کے لئے سوال کرنا جائز نہیں۔ اول اس کے لئے جس کو کھانے کے لئے کوئی چیز نہ ملتی ہو۔ یعنی ایسی حالت ہو گئی ہو کہ اور کسی ذریعہ سے اس کو کھانا ملنا ناممکن ہو۔ دوم جس پر بِلا اس کے کسی قصور کے چٹی پڑ گئی ہو اور اسے وہ ادا نہ کر سکتا ہو۔ سوم کوئی قتل ہو گیا ہو اور اس کی دیت ادا کرنے کی اس میں طاقت نہ ہو۔ ایسے موقع پر اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے معنے یہ ہوں کہ ان لوگوں کے لئے دوسروں کو سوال کرنا جائز ہے نہ کہ خود اس کو۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ دو شخص رسول کریمؐ کے پاس سوالی بن کر آئے آپ نے ان کو سر تاپا دیکھا اور فرمایا۔ إن شئتما أعطیتکما، ولا حظ فیھا لغنی، ولا لقوی مکتسب (مسند احمد بن حنبل جلد5 صفحہ362) یعنی اگر تم چاہو تو میں تم کو مال دے دیتا ہوں۔ مگر صدقہ کے مال میں صدقہ دینے والے آسودہ حال اور کمانے والے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح آپ نے ایک اور موقع پر فرمایا۔ من سأل وعندہ ما یغنیہ فإنما یستکثر من نار جھنم یعنی جو شخص دوسروں سے سوال کرے اور اس کے پاس اتنی چیز موجود ہو جو اس کے کام آسکے تو وہ جہنم کی آگ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہؐ! ومایغنیہ؟ کفایت کرنے والی چیز سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا ما

یغدیه أو یعشیه ایسی چیز جو اس کے صبح یا شام کے کھانے میں کام آسکے۔

(مسند احمد بن حنبل جلد 4 صفحہ 181)

غرض لَا یَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا (البقرہ: 274) میں بتایا کہ وہ لوگ دوسروں سے سوال ہی نہیں کرتے۔ کیونکہ خود سوال کرنا ہی اپنی ذات میں إِلْحَاف ہے۔"

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ 628 - 629 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

ایک اور مقامِ قرآنی کی تفسیر میں یہی رجحان نظر آتا ہے۔ چنانچہ آپ سورت التکویر کے تعارف میں قرآنی کلمہ "الساعۃُ" کو احادیث نبویہ کی روشنی میں مزید کھولتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جیسا کہ قرآن کریم کے محاورہ میں قیامت سے مراد اس دنیا کا انقلاب بھی لیا گیا ہے۔ احادیث نبی کریمؐ میں بھی قیامت اور ساعۃ ان معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں۔ چنانچہ بخاری کتاب الایمان باب سوال جبریل عن علم الساعۃ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت جبریل انسانی شکل میں متمثل ہو کر رسول کریمؐ اور آپ کے ساتھ کے صحابہ کو بھی نظر آئے اور رسول کریمؐ سے سوال کیا کہ متی الساعۃ؟ قیامت کب آنے والی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ما المسئول عنها باعلم من السائل، وساخبرك عن اشراطها إذا ولدت الامة ربها، وإذا تطاول رعاة الإبل البهم فی البنیان یعنی اس بارہ میں سائل سے زیادہ مجھے علم نہیں ہاں میں اس کی علامات بتا دیتا ہوں۔ اس کی علامات یہ ہیں کہ لونڈی اپنے مالک کو جنے گی اور اونٹوں کے چرانے والے اونچے اونچے مکان بنائیں گے۔ چنانچہ یہ بنو عباس کی ترقی کے زمانہ میں ہوا۔ اکثر بادشاہوں نے لونڈیوں کو گھر میں ڈالا اور ان کی اولاد بادشاہ ہوئی اور ان کے رشتہ داروں

کے ذریعہ سے عرب حکومت تباہ ہو گئی۔ اسی طرح اس زمانہ میں بجائے محنت اور قربانی اور سفروں کے عرب لوگوں نے شہری زندگی اختیار کر لی اور بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں مشغول ہو گئے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک مجلس میں رسول کریمؐ باتیں کر رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے ساعت کے بارہ میں سوال کیا۔ آپؐ بات کرتے رہے اور اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ جب پہلی بات ختم کر چکے تو فرمایا۔ ساعت کے بارہ میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ سوال کرنے والے نے کہا کہ میں حاضر ہوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا۔ فإذا ضیعت الامانة فانتظر الساعة یعنی جب امانت میں کمی آ جائے گی تو اس وقت سے قیامت کا انتظار کرو۔ اس پر اس شخص نے کہا۔ کیف إضاعتها؟ یا رسول اللہ ﷺ امانت کس طرح ضائع ہو گی؟ اس پر آپؐ نے فرمایا۔ إذا وسد الامر إلی غیر اهله فانتظر الساعة۔ (بخاری کتاب العلم بَابُ مَنْ سُئِلَ عِلْمًا وَهُوَ مشغُولٌ فِي حَدِيثِهِ) یعنی امانت سے مراد امانت حکومت ہے۔ پس جب حکومت نااہل لوگوں کے سپرد کی جائیگی اس وقت سے قیامت کے منتظر ہو جاؤ۔ اس جگہ قیامت سے مراد مسلمانوں کی تباہی اور تنزّلی کا وقت ہے۔

اسی طرح بخاری میں آتا ہے۔ إن من اشراط الساعة ان یرفع العلم ویثبت الجهل، ویشرب الخمر، ویظهر الزنا (کتاب العلم باب رفع العلم) یعنی قیامت کی علامات میں سے یہ علامات ہیں کہ علم اٹھ جائیگا اور جہالت قائم ہو جائیگی اور شراب پی جائیگی اور زنا علی الاعلان کیا جائے گا۔ یعنی کنچنیوں کا طریق رائج ہو جائیگا اور لوگ اپنی زناکاریوں کا مجالس میں فخر سے ذکر کریں گے۔ اس حدیث میں قیامت سے مراد اسلام کا تنزّل ہے۔

اسی طرح بخاری کی حدیث ہے لا تقوم الساعة حتی یقبض العلم وتکثر الزلازل ویتقارب

الزمان وتظهر الفتن ويكثر الهرج وهو القتل حتى يكثر فيكم المال فيفيض (کتاب الاستسقاء۔باب ما قیل فی الزلازل) یعنی قیامت اس وقت تک نہ آئیگی جب تک علم مٹ نہ جائے اور زلازل کثرت سے نہ آئیں اور علم تاریخ ترقی نہ کر جائےاور کثرت سے فتن ظاہر نہ ہوں اور قتل کا رواج ترقی نہ کر جائے اور مال کی اس قدر زیادتی نہ ہو جائے کہ لوگ مسرف ہو جائیں۔ یہ حدیث بھی مسلمانوں کے تنزّل کو قیامت کا نام دیتی ہے۔ اسی طرح بخاری میں حدیث ہے۔ لا تقوم الساعة حتى تقاتلوا قوما نعالهم الشعر”لا تقوم الساعة حتى تقاتلوا قوماً كانّ وجوههم المجان المطرقة (کتاب الجهاد باب قتال الترك) یعنی قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک تم اس قوم سے جنگ نہ کرو کہ ان کی جوتیاں بالوں والی ہوں گی اور ان کے منہ ڈھالوں کی طرح چپٹے ہوں گے۔ یہ ترکوں کے حملوں کی طرف اشارہ ہے اور مراد یہ ہے کہ اسلامی تنزل کا زمانہ ترکوں کے حملوں سے شروع ہو گا۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ بعثت انا والساعة کھاتین، یعنی إصبعين (بخاری،کتاب الرقاق۔باب قول النبی انا والساعة کھاتین) یعنی آپ نے اپنی دونوں انگلیوں کو جوڑ کر دکھایا اور فرمایا کہ میرا اور قیامت کا زمانہ اسی طرح ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ رسول کریمؐ کے زمانہ پر تو تیرہ سو سال ہو گئے اور اب تک قیامت نہیں آئی۔ پس اس جگہ قیامت کے معنے کچھ اور ہیں، اور وہ معنے اسلام کی ترقی کے ہیں اور آپؐ کا ارشاد یہ ہے کہ بعض نبی ایسے آئے ہیں کہ ان کی قوم نے ان کے مرنے کے بہت بعد جا کر ترقی کی ہے مگر مجھ سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ میرے زمانہ میں ہی اسلام کی ترقی ہو جائے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اسی طرح ترمذی میں ہے۔ اقتراب الساعة هلاك العرب یعنی قیامت کے قریب آنے کے ایک معنے عربوں کی ہلاکت کے ہیں چنانچہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ کے میں نے یہی معنے کئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم اور احادیث میں لفظ قیامت کے معنے قیامت کبریٰ کے بھی ہیں یعنی اس قیامت کے جو تمام انسانوں کی ہلاکت سے یا ان کے دوبارہ اٹھنے سے ظاہر ہو گی اور اس کے معنے کسی قومی ترقی کے بھی ہیں اور کسی قوم کے تنزّل کے بھی اور کسی فرد کی موت کے بھی۔ پس رسول کریمؐ نے جو یہ فرمایا کہ جو شخص یوم القیامة کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہے تو وہ ان سورتوں کو پڑھ لے اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہو سکتا کہ ان سورتوں میں صرف اسی قیامت کا ذکر ہے جو مرنے کے بعد آنیوالی ہے۔ اگر قرآن قیامت کے کئی معنے لے سکتا ہے تو رسول کریمؐ بھی اس لفظ کو اس کے متعدد معانی میں استعمال فرما سکتے ہیں۔

(تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ 192 - 194 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

(روزنامہ الفضل آن لائن ایڈیشن مطبوعہ 13 ستمبر 2022ء لندن)

قسط 2
صرفی نحوی و لغوی منہج

جس تفسیر میں قرآن کی صرفی و نحوی تراکیب سے یا قرآنی لغت جو ذو المعارف ہے سے قرآنی مطالب و معانی سمجھنے کی کوشش کی جائے اس خاص منہج کو صرفی و نحوی یا لغوی منہج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ویسے تو عام طور پر قریباً ہر قسم کی تفسیر میں لغت پر کچھ نہ کچھ بحث ہوتی ہی ہے مگر خاص طور پر اس طرح کے منہج کی تفاسیر میں مفردات قرآن، آیات کی تراکیب، صرف و نحو، اشتقاق و معانی اور لغت وغیرہ کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔

اس منہج پر لکھی جانے والی یا اس منہج کو خاص طور پر استعمال کرنے والی تفاسیر میں مندرجہ ذیل معروف ہیں۔

- التبیان فی تفسیر القرآن محمد بن حسن طوسی (385ھ تا 460ھ) (شیعہ تفسیر)
- المفردات فی غریب القرآن لامام راغب الاصفہانی (المتوفیٰ 502ھ)
- املاء ما من بہ الرحمن من وجوہ الاعراب والقرأت فی جمیع القرآن لابی البقاء العکبری (538ھ تا 616ھ)
- التبیان فی اعراب القرآن لابی البقاء العکبری (538ھ تا 616ھ)
- البحر المحیط از ابو حیان غرناطی (654ھ تا 745ھ)
- اعراب القرآن وبیانہ لمحی الدین بن احمد مصطفی درویش (1908ء تا 1982ء)

- ایسر التفاسیر لکلام لعلی الکبیر لابی بکر جابر الجزائری (1921ء تا 2018ء)
- اوربرصغیر پاک و ہند میں اسی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر میں مندرجہ ذیل مشہور ہیں۔
- لغات القرآن۔۔۔مفہوم القرآن از غلام احمد پرویز (1903ء تا 1985ء)
- مترادفات القرآن از مولانا عبدالرحمٰن کیلانی (1923ء تا 1995ء)

تفسیر کبیر میں صرفی و نحوی/لغوی منہج کی چند مثالیں

آپ سورت طٰہٰ کی آیت 16 اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

''اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ عذاب کی گھڑی آنے والی ہے، قریب ہے کہ میں اسے چھپا دوں اور یہ بھی کہ عذاب کی گھڑی آنیوالی ہے قریب ہے کہ میں اسے ظاہر کر دوں۔ اَخْفَى الشيئَ کے ایک معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ اَزَالَ خِفَاءَهٗ اس کے پردہ کو دور کر دیا، یعنی اسے ظاہر کر دیا۔ عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی مجرد فعل کو باب افعال میں لے آئیں تو اس میں سلب کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں، شَكَانِى فَاَشْكَيْتُهٗ کہ اس نے شکایت کی تو میں نے اس کی شکایت کا ازلہ کر دیا۔ پس اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ اسے چھپائے رکھوں اور یہ بھی کہ اسے ظاہر کر دوں۔ اگر اس کے معنے چھپائے رکھوں کے کئے جائیں تو اس آیت کا یہ مفہوم ہو گا کہ یہ مخالف اتنے گندے لوگ ہیں کہ میں

چاہتا ہوں کہ ان سے اس عذاب کی گھڑی کو پوشیدہ رکھوں تا کہ عذاب ان پر اچانک آ جائے اور انہیں اس کے ازالہ کا کوئی موقع نہ مل سکے اور اگر اس کے معنے ظاہر کرنے کے ہوں تو مراد یہ ہو گی کہ وہ گھڑی جو تیری ترقی اور تیرے دشمنوں کی تباہی کے لئے مقدر ہے وہ آ رہی ہے اور قریب ہے کہ میں اس کو ظاہر کر دوں۔ یعنی عنقریب ایسے حالات پیدا ہونے والے ہیں کہ تیرے دشمنوں کی تباہی کے آثار ظاہر ہونے لگ جائیں گے اور میری ان آثار کو ظاہر کرنے سے غرض یہ ہو گی کہ ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق جزا پا لے۔ جو ماننے والے ہیں وہ انعام حاصل کرلیں اور جو منکر ہیں وہ سزا پا لیں۔ بِمَا تَسۡعٰی میں باء کے معنے مطابق کے ہیں اور ما مصدریہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تا ہر نفس اپنے عمل کے مطابق جزا پا لے۔“

(تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ 411 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

سورت النحل کی آیت 6 وَالۡاَنۡعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمۡ فِيۡهَا دِفۡءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ کی تفسیر میں آپ لکھتے ہیں۔

”یہ جو فرمایا مِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ اس میں مِنۡهَا کو پہلے رکھا گیا ہے جو تخصیص کے معنے دیتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض پڑ سکتا ہے کہ کیا انسان اَنۡعَام کے سوا دوسری چیزوں کے گوشت نہیں کھاتے یا سبزیاں نہیں کھاتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تخصیص کبھی حصر کے مضمون کے اظہار کے لئے آتی ہے اور کبھی یہ بتانے کے لئے کہ اس قسم کی چیزوں میں سے یہ اہم ہے اور اس جگہ پر اس کے یہی معنے ہیں اور مراد یہ ہے کہ تمہاری بڑی غذا اَنۡعَام کا گوشت یا دودھ گھی ہے۔ بے شک مرغی شکار وغیرہ بھی انسان کھاتے ہیں۔ لیکن اہم غذا اَنۡعَام کا گوشت یا دودھ گھی ہے یا جو بمنزلہ اَنۡعَام کے ہیں۔ جیسے نیل گائے یا ہرن وغیرہ۔ یہ چیزیں

انسانی غذا کا اہم جزو ہیں اور دوسری اشیاء ان سے اتر کر ہیں۔ اس آیت میں انْعَام کے دو استعمال تو کھول کر بیان فرما دیئے۔ اوّل گرمی سردی کے اثرات سے بچاتے ہیں یعنی ان کی کھالیں اور اون وغیرہ کو تم استعمال کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تم ان کا گوشت کھاتے ہو اور دودھ پیتے ہو۔ تیسرا لفظ مَنَافِع کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے مراد جانوروں کی تجارت بھی ہو سکتی ہے اور نسل کشی بھی۔"

(تفسیر کبیر جلد چہارم صفحہ130 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

سورت البقرہ کی آیت 130 رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ کی تفسیر میں آپ لکھتے ہیں۔

"اے ہمارے ربّ! ان میں ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرما۔ تنوین تحقیر کے لئے بھی آتی ہے اور تعظیم کے لئے بھی۔یہاں تعظیم کے لئے آئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرما۔"

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ 187 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

سورت البقرہ کی آیت 215 کی تفسیر میں ''حَتّٰی'' اور ''متیٰ'' کا عربی زبان میں استعمال پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ انہیں مالی مشکلات بھی پیش آئیں اور جانی بھی اور وہ سر سے پاؤں تک ہلا دیئے گئے اور ان پر اس قدر ابتلاء آئے کہ آخر اس وقت کے رسول اور مومنوں کو دُعا کی تحریک پیدا ہو گئی اور وہ پکار اُٹھے کہ اے خدا! تیری مدد کہاں ہے۔ اس آیت کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور اس کے پاک بندے بھی کسی وقت اللہ تعالیٰ کی مدد سے ایسے

مایوس ہو جاتے ہیں کہ انہیں مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ کہنا پڑتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس مایوسی کا تصور بادی النظر میں پیدا ہوتا ہے اس سے انبیاء اور ان پر ایمان لانے والے کلیۃً پاک ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّہٗ لَا یَایۡـَٔسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (یوسف آیت 88) کہ صرف کافر ہی خداتعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب مَتٰی کا لفظ بولیں تو اس سے مراد مایوسی نہیں ہوتی بلکہ تعیین کے لئے ایک درخواست ہوتی ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ فلاں بات کے لئے ایک وقت مقرر فرماد یا جائے۔ ایسا ہی اس جگہ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ کے یہ معنے نہیں کہ وہ مایوسی کا شکار ہو کر ایسا کہتے ہیں بلکہ درحقیقت ان الفاظ میں وہ یہ درخواست کرتے ہیں کہ الٰہی! اس بات کی تعیین فرمادی جائے کہ وہ مدد کب آئے گی۔ گویا مزید اطمینان کے لئے وہ آنے والی نصرت سے وقت کی تعیین کروانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد جلد نازل ہو۔ یہ دُعا کا ایک موثر طریق ہے اور اس میں یہ اشارہ مخفی ہے کہ ان پر اس قدر ابتلاء آئے کہ وہ ہلادیئے گئے اور ان میں دُعا کی تحریک پیدا ہو گئی اور ابتلاؤں کی بڑی غرض بھی یہی ہوتی ہے کہ خداتعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو جب مومنوں کو دعا کی تحریک ہوتی ہے تو خداتعالیٰ آسمان سے اپنی نصرتِ نازل فرما دیتا ہے اور ان کے مصائب کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

مگر اس کے علاوہ "حتی" کے معنے "کَيۡ" کے بھی ہوتے ہیں اور یہ معنے کُتب نحو اور قرآن کریم سے ثابت ہیں۔ مغنی اللبیب میں لکھا ہے وَمُرَادِفَةٌ کَيِ التعلیلیة "حَتّٰی" یعنی "حَتّٰی" کے معنے اس "کَيۡ" کے مترادف بھی ہوتے ہیں جو کسی بات کی وجہ بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی اس "حَتّٰی" سے پہلے جو بات ہوتی ہے وہ بعد میں آنے والی بات کے لئے بطور سبب کے ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی "حَتّٰی" ان

معنوں میں آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ منافقون میں آتا ہے۔ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا (المنٰفقون:8) یعنی جو لوگ رسول کریمؐ کے پاس جمع ہیں ان پر خرچ نہ کرو۔ تاکہ وہ بھاگ جائیں۔ نحوی اس کی یہ مثال بھی دیتے ہیں کہ اَسْلِمْ حَتّٰى تَدْخُلَ الْجَنَّةَ یعنی فرمانبرداری کرتا کہ تو جنت میں داخل ہو جائے۔ ان معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ زلزلہ جو کفار کے ہاتھوں سے ہم نے پیدا کیا اس کی غرض ہی یہ تھی کہ ہمارے بندے ہم سے مانگیں اور ہم ان کو دیں۔ پس مانگنے کی طرف توجہ پھیرنے اور اپنی قوتِ فضل کو ظاہر کرنے کے لئے اس وقت تک ہم چُپ رہے جب تک کہ ان کے دل میں دعا کی زور سے تحریک پیدا نہ ہوئی اور یہ تحریک ہم نے خود کروائی تا کہ ایک طرف ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھے اور دوسری طرف جب اللہ تعالیٰ کی نصرت معجزانہ طور پر آئے تو ان کے ایمان بڑھیں اور کفار میں سے جو غور کرنے والے ہوں انہیں ہدایت حاصل ہو۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ جب یہ غرض پوری ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرمادیتا ہے کہ لو اب ہماری مدد آ گئی۔"

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ467 - 468 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

فقہی/قانونی منہج/فقیہانہ رجحان

جس تفسیر میں قرآن کریم سے فقہی احکام و مسائل کا استخراج کیا گیا ہو تو ایسی تفسیر کو فقہی منہج کہا جاتا ہے۔اس منہج میں مقلدین اور غیر مقلدین مسلمانوں کی طرز تفسیر میں قدرے اختلاف ہے۔ مقلدین اپنے فقہی مذاہب کے علماء و فقہاء کی آراء بتاتے ہیں پھر اس سے استنباط کرتے ہیں جبکہ غیر مقلدین اپنے اپنے مخصوص نظریات کے مطابق تفسیر پیش

کرتے ہیں۔ اس منہج کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں قانون اسلامی کو بحث میں لایا جاتا ہے۔ ذیل میں دونوں طرح کی تفاسیر کی مثالیں پیش کی جائینگی۔

فقہی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

- احکام القرآن لامام ابی بکر الجصاص (المتوفیٰ: 370ھ) (فقہ حنفی)
- احکام القرآن للکیاالھراسی لعماد الدین ابو الحسن علی بن محمد (المتوفیٰ: 504ھ) (فقہ شافعی)
- احکام القرآن لابن العربی (المتوفیٰ: 543ھ) (فقہ مالکی)
- کنز العرفان فی فقہ القرآن لمقداد السیوری
- (المتوفیٰ: 826ھ) (فقہ امامی اثنا عشری)

قانونی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

- نکت القرآن الدالۃ علی البیان لمحمد بن علی الکرجی القصاب (المتوفیٰ :360ھ) (اطلاق قوانین اسلامی)
- الجامع لاحکام القرآن لامام ابو عبداللہ محمد بن احمد القرطبی (المتوفیٰ:671ھ)
- برصغیر پاک و ہند میں فقہی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر میں مندرجہ ذیل مشہور ہیں۔
- معارف القرآن از مفتی محمد شفیع دیوبندی (1897ء- 1976ء) (مقلد حنفی مکتبہ فکر)

❁ تفسیر القرآن از مولانا عبدالرحمن کیلانی (1923ء - 1995ء) (غیر مقلد اہلحدیث مکتبہ فکر)

تفسیر کبیر میں فقہی/قانونی منہج کی چند مثالیں

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ المصلح الموعود قرآن کریم کی آیت قصاص کو اسلامی فقہ قصاص کی بنیاد قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”بنی نوع انسان کو جو تعلیم دی گئی ہے یہ یہودیوں کی اتباع میں نہیں دی گئی بلکہ ان احکام کے سلسلہ میں دی گئی ہے جو اکیسویں رکوع سے دیئے جارہے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو پچھلی آیات میں بتلایا گیا تھا کہ کامل الایمان لوگوں کی علامات یہ ہوتی ہیں کہ وہ بَاْسَآءَ میں بھی صبر کرتے ہیں اور ضَرَّآء میں بھی صبر کرتے ہیں اور حِیْنَ البَاْس بھی صبر کرتے ہیں یعنی خواہ ان پر مالی مشکلات آئیں اور فقر وفاقہ تک ان کی نوبت پہنچ جائے تب بھی وہ جادہ استقامت پر قائم رہتے ہیں اور خواہ جسمانی مشکلات آئیں اور بیماریاں ان کو گھیر لیں تب بھی وہ صبر کرتے ہیں اور خواہ لڑائیوں میں مارے جائیں تب بھی وہ دشمن سے مرعوب نہیں ہوتے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ صبر کا سلسلہ کب تک چلے گا۔ کیا لوگ ہمیں مارتے ہی چلے جائیں اور ہم خاموش بیٹھے رہیں اور اگر ایسا ہو تو ہماری زندگی کی کیا صورت ہو گئی؟ اس لئے فرمایا کہ تمہارا کام تو یہی ہے کہ تم صبر کرو۔ لیکن کچھ اور لوگ جن کے سپرد حکومت کا نظام کیا گیا ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ظالموں سے بدلہ لیں اور انہیں کیفر کردار تک پہنچائیں چنانچہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی میں انہی لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے اس جگہ

''تم'' سے صرف حکام مراد ہیں جو لاء اینڈ آرڈر یعنی نظم و ضبط کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ عام لوگ مراد نہیں اور کُتِبَ کہہ کر بتایا ہے کہ حکام کا فرض ہے کہ وہ قصاص لیں۔ حکام کو یہ اختیار نہیں کہ وہ معاف کر دیں۔ اَلصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ میں تو عوام مخاطب تھے مگر کُتِبَ عَلَیْکُمْ میں صرف حکام سے خطاب کیا گیا ہے کہ وہ قصاص لیں اور فِی الْقَتْلٰی کہہ کر تصریح کر دی گئی ہے کہ اس میں جروح شامل نہیں اور درحقیقت یہی وہ آیت ہے جس میں قتل کی سزا کے متعلق اسلامی تعلیم بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قتل کی سزا قتل ہے اور یہ عام حکم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فِی الْقَتْلٰی فرمایا ہے کہ مقتولوں کے متعلق یہ حکم ہے یہ کوئی سوال نہیں کہ وہ مقتول کون ہو اور کس قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ اس آیت کے سوا قتلِ عمد کی دنیوی سزا کا ذکر قرآن کریم کی کسی اور آیت میں نہیں ہے پس یہی آیت ہے جس پر اسلامی فقہ کی بنیاد ہے۔''

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ 358 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

آپؑ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ سورۃ التکویر آیت 9 کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

''آپؐ سے عزل کے متعلق پوچھا کہ اس بارہ میں آپ کا کیا حکم ہے فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَالِكَ الْوَاْدُ الْخَفِیُّ۔ رسول کریمؐ نے فرمایا یہ بھی ایک وأدخفی ہے۔ یہ روایت مسلم سعید بن ابی ایوب سے اور مالک بن انس سے بھی نقل کی ہے اور ابو داؤد اور الترمذی اور النسائی نے یہ روایت ابی الاسود سے روایت کی ہے۔ اس روایت سے بعض لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب عزل بھی وادخفی ہے تو یہ فعل بھی کسی سزا کا مستحق ہونا چاہئے لیکن یہ بات روایت سے درست معلوم نہیں ہوتی۔ اوّل تو اگر عزل منع ہے اس وجہ سے کہ عزل وادخفی ہے تو پھر حاملہ سے جماع بھی منع ہونا چاہئے مگر حمل کے ایام میں جماع

کی حرمت کہیں سے ثابت نہیں حالانکہ وہ واؤ قطعی اور یقینی عمل ہے۔ دوسرے عزل کے جائز ہونے کے متعلق بھی احادیث آتی ہیں مثلاً ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریمؐ سے عزل کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا بے شک کرو جس متنفّس کو خدا نے پیدا کرنا ہے وہ تو اُسے بہر حال پیدا کر کے رہے گا (بخاری کتاب القدر باب کان امر اللّٰہ قدراً مقدوراً) پس چونکہ عزل کا جواز بعض دوسری احادیث سے ثابت ہے اس لئے گویا یہ حدیث بڑے بلند پایہ کی ہے مگر میرے نزدیک اس کے یہی معنے ہیں کہ بلاضرورت ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔ اگر کوئی شخص بلاضرورت ایسا کرتا ہے تو وہ واد خفی سے کام لیتا ہے یعنی وہ شخص جس کی عزل سے غرض نسل انسانی کا انقطاع ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجرم اور گنہگار ہے ورنہ اور کئی صورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن میں عزل ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کی بیوی بیمار ہے۔ وُہ دوسری شادی کی توفیق نہیں رکھتا لیکن خود اُس میں خدا نے قوائے شہوانیہ پیدا کئے ہیں۔ دوسری طرف ڈاکٹر کہتا ہے کہ اگر عورت کو حمل ہو گیا تو اس کی جان کو خطرہ ہو گا ایسی حالت میں نہ صرف عزل جائز ہو گا بلکہ اگر حمل ہو جائے تو اُس کا نکلوا دینا بھی جائز ہو گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے میں نے خود سنا ہے کہ ایسی حالت میں اگر کوئی عورت حمل نہیں نکلواتی اور وہ مر جاتی ہے تو ہمارے نزدیک وہ خودکشی کرنے والی ہے۔ آپ نے فرمایا ایسی حالت میں ضروری ہے کہ بچہ کو نکلوا دیا جائے کیونکہ بچہ کے متعلق تو ہمیں کچھ علم نہیں کہ اُس نے کیسا بننا ہے مگر ایک زندہ وجود ہمارے سامنے ہوتا ہے اور اُس کی جان کی حفاظت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ اس کو بچایا جائے اور اس کے بچہ کو تلف ہونے دیا جائے۔ لیکن اگر کوئی خشیتہ املاق کی وجہ سے عزل کرتا یا حمل نکلواتا ہے تو وہ ایک ناجائز فعل کا ارتکاب کرتا ہے۔ بہر حال عزل کے جواز یا عدم جواز کا فتویٰ عورت کے حالات کے ساتھ تعلق رکھتا

ہے اگر ضرورت کے موقع پر ایسا کیاجاتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اگر بلاضرورت کیا جاتا ہے تو ناپسندیدہ ہے اور اگر نسل انسانی کے انقطاع کے لئے ایسا کیا جاتا ہے تو حرام ہے۔ مثلاً یورپ والے صرف نسل انسانی کے انقطاع کے لئے ایسے کرتے ہیں اور چونکہ اس کے نتیجہ میں قوم تباہ ہو جاتی ہے اس لئے یہ فعل یقینا ناجائز اور حرام ہو گا اور اگر کوئی بلاضرورت کرتا ہے تو وہ ایک مکروہ کام کرتا ہے اور اگر ضرورت حقہ پر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ ایک جائز کام کرتا ہے۔ بہر حال اس مسئلہ کے تینوں پہلو ہیں۔ جب عزل کو قومی تباہی کا موجب بنا دیا جائے تو یہ حرام ہو جاتا ہے۔ جب عزل قومی تباہی کا موجب نہ ہو لیکن اس کی کوئی ضرورت بھی نہ ہو تو یہ مکروہ ہوتا ہے اور جب کسی عورت کی جان بچانے کے لئے یا کسی ایسی ہی ضرورت کے لئے جسے شریعت جائز قرار دیتی ہو ایسا کیا جائے تو یہ جائز ہوتا ہے۔ پس عزل وأدلخفی کے ماتحت نہیں آسکتا۔ وہی عزل اس جرم کا مرتکب بناتا ہے جو قومی تباہی کا موجب بن جائے جیسے فرانس وغیرہ ممالک میں اس کا رواج ہو رہا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ وہاں کی آبادی خطرناک حد تک کم ہو گئی ہے اور وہ قوم دوسروں کے مقابلہ میں بالکل مقہور اور ذلیل ہو گئی ہے اسی لئے رسول کریمؐ نے فرمایا: تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ (نسائی جلد دوم کتاب النکاح) کہ جو عورتیں کثرت سے بچے جننے والی ہوں اُن سے شادی کیا کرو کیونکہ اس طرح قوم کی ترقی ہوتی ہے۔"

(تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ 223 - 224 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

آپ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ﴿۳﴾ سورۃ البینۃ آیت 3 کی تفسیر کرتے ہوئے مُطَهَّرَةً کے مختلف معانی بیان کرتے ہوئے اسلامی علم فقہ اور اس کے یہودی و عیسائی فقہ کی اصلاح کرنے کی بے نظیر خوبی کو بیان کرتے ہیں۔

"تیسرے معنے مُّطَھَّرَۃً کے دھلے ہوئے کے ہیں۔ دھلی ہوئی چیز اصل چیز سے علیحدہ نہیں ہوتی صرف اصل چیز پر جو خارجی اثرات ہوتے ہیں ان میں تبدیلی پیدا کر دی جاتی ہے۔ ان معنوں کے لحاظ سے مُطَھَّرَۃً کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ فقہی پیچید گیاں جو یہودیوں یا عیسائیوں نے پیدا کر دی تھیں ان سے قرآن کریم نے نجات دلائی ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جب بھی کسی مذہب پر لمبا زمانہ گزر جاتا ہے اُس کے ساتھ فقہی پیچید گیاں شامل ہو جاتی ہیں۔ فقہ کی اصل غرض تو یہ ہوتی ہے کہ جو مسائل الٰہی کتاب میں نص کے طور پر نہیں آئے ان کا استخراج کیا جائے۔ لیکن آہستہ آہستہ جب فقہ میں ضعف آتا ہے خود اصل مسائل میں تصرّف شروع ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کی نقائص کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو اباحت کی طرف لے جاتے ہیں اور کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو ظاہر کی طرف انتہا درجہ کی شدت کے ساتھ بلاتے ہیں یہی حال رسول کریمؐ کے زمانہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کا تھا اگر یہودیوں نے سزا کی تعلیم پر بے انتہا زور دیا تھا۔ تو عیسائیت نے نرمی کی تعلیم پر بے انتہا زور دے دیا۔ اب یہ دونوں مسائل ہی ضروری تھے لیکن یہودی فقہ اور عیسائی فقہ نے ان دونوں کو الگ الگ احکام کی شکل میں بدل دیا۔ جب اسلام آیا تو اس نے اس پیچید گی کو بالکل دور کر دیا اور غلط فقہ کا تعلیم پر جو اثر تھا اس کو دھودیا مثلاً اسلام نے بھی کہا ہے کہ دانت کے بدلے دانت آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان۔ مگر اسلام نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا عفو بڑی اچھی چیز ہے تمہیں اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے اسی طرح اسلام نے بھی یہی کہا کہ نرمی اور عفو بڑی اچھی چیز ہے مگر ساتھ ہی کہا کہ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ (الشوریٰ:41) اُسی وقت عفو جائز ہے جب عفو کے نتیجہ میں مجرم کی اصلاح کی امید ہو۔ اگر یہ خیال ہو کہ عفو مجرم کو اور بھی بگاڑ دے گا اور اُسے بُرے اعمال پر اور زیادہ جرأت دلا دے گا تو اس وقت

عفو سے کام لینا تمہارے لیے جائز نہیں۔ غرض یہودی تعلیم میں یہ زور کہ ضرور دانت کے بدلہ میں دانت توڑو۔ آنکھ کے بدلہ میں آنکھ پھوڑواور کان کے بدلہ میں کان کاٹو، فقہ کا ہی نتیجہ تھا ورنہ موسیٰؑ کی تعلیم میں یہ بات نہ تھی۔ اسی طرح عیسائیت کی تعلیم میں یہ بات کہ تم ضرور معاف کرو اور اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دو فقہ کی وجہ سے ہی تھی ورنہ حضرت مسیحؑ تو صاف کہتے ہیں کہ میں تورات کو بدلنے کے لیے نہیں آیا۔ جب وہ تورات کو بدلنے کے لیے نہیں آئے تو اُس کے قانون سزا کو وہ کلیتہً کس طرح مٹا سکتے تھے۔

غرض وہ فقہی پیچید گیاں جو یہودیوں اور عیسائیوں نے پیدا کر دی تھیں اور غلط فقہ کی وجہ سے جو نقائص رونما ہو گئے تھے قرآن کریم نے ان سب کو دُور کر دیا ہے اور یہی قرآن کریم کا مطہر یعنی دُھلا دُھلایا ہونا ہے۔ کہ اُس نے ایسی تعلیم دی جو ہر قسم کی پیچید گیوں سے پاک ہے۔"

(تفسیر کبیر جلد نہم صفحہ 363 - 364 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

اسلامی قانون کی خوبی بیان کرتے ہوئے آپ سورت بنی اسرائیل کی آیت 35 وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۵﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"بچے زیادہ طور پر اتفاقی حادثات کے نتیجہ میں یتیم ہوتے ہیں جن میں قتل،وبائیں وغیرہ شامل ہیں۔ پس قتل کے حکم کے بعد جس سے دو گھروں میں بچے یتیم رہ جائیں گے مقتول کے گھر میں بھی اور قاتل کے گھر میں بھی۔ جب وہ قتل کی سزامیں قتل کیاجائے گا۔یتامیٰ

کے حقوق کو بیان کیا۔

اس بارہ میں فرماتاہے کہ یتامیٰ کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اِلَّا بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ یعنی صرف ایک طریق ایک کے مال پر تصرف کرنے کاہے کہ اس سے بہتر سے بہتر نتیجہ پیدا کیا جائے۔یعنی صرف یہی نہیں کہ ان کے مال کو ناجائز طورپر استعمال نہ کرو بلکہ ان کو اس طرح استعمال کرو کہ وہ مال بڑھیں اوریتیموں کافائدہ ہو اس آیت میں اسلامی نظام کا ایک اورایسا حکم بیان کیا گیا ہے جس میں اسلام دوسرے مذاہب سے ممتاز اورمنفرد ہے یتیموں سے حسن سلوک کاحکم توسب مذاہب میں ملتاہے۔ لیکن یہ حکم کہ ان کے اموال کی حفاظت کرواوران کو بڑھانے کی کوشش کرو۔ کسی اورمذہب میں نہیں ملتا۔ گویا اس آیت میں ایک عام کورٹ آف وارڈز مقرر کیا گیا ہے یعنی نابالغوں کی جائداد کی حفاظت کرنے والا محکمہ۔ آج کل مغربی حکومتوں کے ماتحت اس حکم پر عمل ہو رہاہے۔ مگر اس خیال کی بنیاد اسلام ہی نے آج سے تیرہ سوسال پہلے قائم کی ہے۔“

(تفسیر کبیر جلدچہارم صفحہ 332 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

(روزنامہ الفضل آن لائن ایڈیشن مطبوعہ 20 ستمبر 2022ء لندن)

قسط 3
کلامی منہج / متکلمانہ رجحان

بعض مفسرین اسماء و صفات باری تعالیٰ، ملائکۃ اللہ، اسلامی عقائد و نظریات پر بحث کرتے ہیں اور قرآن کریم کی نصوص سے اپنے دلائل تیار کرتے ہیں اور ان کا اثبات کرتے ہیں۔ مخالف اسلام قوتوں کو ان دلائل سے جواب دیتے ہیں۔ اس منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر کلامی تفاسیر کہلاتی ہیں۔ان میں سے معروف تفاسیر کو مثال کے طور پر پیش کیا جائیگا۔

کلامی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

- مفاتیح الغیب (تفسیر کبیر)لفخر الدین الرازی (المتوفیٰ:606ھ)
- انوار التنزیل و اسرار التاویل عبداللہ بن عمر بن محمد البیضاوی (المتوفیٰ:685ھ)
- غرائب القرآن و رغائب الفرقان لنظام الدین بن الحسن بن محمد الخراسانی النیسابوری (المتوفیٰ:850ھ)

برصغیر پاک و ہند میں کلامی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر میں مندرجہ ذیل مشہور ہیں۔

- تفسیر القرآن از سر سید احمد خان (1817ء تا 1898ء)
- تنقیح البیان از محمد ناصر الدین دہلوی (1822ء تا 1902ء)

تفسیر کبیر میں کلامی منہج کی چند مثالیں

ہستی و صفات باری تعالیٰ متکلمین اسلام کا ایک خاص موضوع ہے۔ اسی طرح جو متکلمانہ سوچ رکھنے والے مفسرین تھے ان کی تفاسیر میں بھی ہمیں یہی رنگ ملتا ہے۔

آپ لفظ ''اللہ'' کے بارہ میں کچھ ایسے رقمطراز ہوئے۔

''اللہ اس ذات پاک کا نام ہے جو ازلی ابدی اور الحی القیوم ہے اور مالک وخالق اور رب سب مخلوق کا ہے اور اسم ذاتی ہے نہ کہ اسم صفاتی۔ عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں اس خالق و مالک کل کا کوئی ذاتی نام نہیں پایا جاتا۔ صرف عربی میں اللہ ایک ذاتی نام ہے جو صرف ایک ہی ہستی کے لئے بولا جاتا ہے اور بطور نام کے بولا جاتا ہے۔ اللہ کا لفظ اسم جامد ہے مشتق نہیں ہے۔ یعنی نہ یہ اور کسی لفظ سے بنا ہے اور نہ اس سے کوئی اور لفظ بنا ہے۔''

(تفسیر کبیر جلد دہم صفحہ524 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

ہستی و صفات باری تعالیٰ کے موضوع پر حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ المصلح الموعود نے اپنی تفسیر میں خوب معارف کھولے۔ مثلاً قرآن کریم کی صفات الٰہیہ اور ان کے ساتھ انسانی اشتراک کے بارہ میں لکھتے ہیں۔

''پس گو نام کے لحاظ سے صفات الٰہیہ میں دوسروں کو بھی ناقص طور پر اشتراک حاصل ہے مگر حقیقتاً صفات الٰہیہ دوسروں کی صفات سے بالکل مغائر ہے۔ جیسے رب ہونے کے لحاظ سے لوگوں کو ایک قسم کا اشتراک حاصل ہے یا رحیم ہونے یا عالم ہونے یا مالک ہونے میں بھی وہ اِن ناموں مشترک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اشتراک صرف ظاہر میں ہو گا۔ حقیت

دونوں کی جداگانہ ہو گی۔ ناموں میں اشتراک محض اس لئے ہے کہ اس کے بغیر انسان خدا تعالیٰ کی صفات کو سمجھ نہیں سکتا تھا اِسی لئے خدا تعالیٰ کی صفت سے مِلتا جُلتا نام اُس کا رکھ دیا ورنہ انسان کی صفت بالکل اور رنگ کی ہے اور خدا تعالیٰ کی صفت اور رنگ کی۔ یہ طریق صرف تقریب تفہیم کے لئے اختیار کیا گیا ہے ورنہ خدا تعالیٰ کی ربوبیت اور قسم کی اور بندے کی ربوبیّت اور قسم کی۔ خدا کی رحیمیّت اور قسم کی اور بندے کی رحیمیّت اور قسم کی۔ خدا کی مالکیّت اور قسم کی ہے اور بندے کی مالکیّت اور قسم کی۔ خدا اور بندے کا اگر بعض صفات کے لحاظ سے ایک قسم کا نام رکھا جاتا ہے تو اس لئے کہ بندہ خدا تعالیٰ کی صفات کو سمجھ سکے۔ اگر ہم انسان کو بھی مالک کہتے ہیں اور خدا کو بھی مالک کہتے ہیں تو اس کا مفہوم صرف اس قدر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میں جو مالکیّت کی صفت پائی جاتی ہے اس سے ایک ناقص تشابہ انسان کو بھی حاصل ہے نہ کہ ویسی ہی صفت انسان کو حاصل ہے۔ کیونکہ بندے کی صفت ناقص ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی صفت کامل ہوتی ہے۔ پس فرمایا سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى تیرا رب جو اعلیٰ ہے یعنی اُس کی ربوبیّت سب دوسروں سے بلند اور ارفع ہے اُس کی تسبیح کر یعنی خدا تعالیٰ کے صفاتی اسماء میں شریک ہونے کی وجہ سے لوگوں کے بعض ناقص افعال کی بناء پر لوگ خدا تعالیٰ کی صفات کے متعلق بھی کئی قسم کے شبہات میں مُبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ بندے اور خدا کے کام ایک جیسے ہیں۔ تُو اِن شبہات کا ازالہ کر اور خدا تعالیٰ کی ربوبیّت پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں اُن کو دُور کر۔ یہ ایک لطیف اور وسیع مضمون ہے کہ صفات الٰہیہ کے ظاہری اشتراک سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔"

(تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ 393 - 394 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

قیام امن کے حوالہ سے صفات الٰہیہ کے عظیم الشان نظام کے حوالہ سے سورت الشعراء کی ابتدائی آیات کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

”ہر شخص سمجھ سکتاہے کہ خالی امن کی خواہش امن پیدا نہیں کر دیا کرتی۔ کیونکہ بالعموم امن کی خواہش اپنے لئے ہوتی ہے دوسروں کے لئے نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب لوگ کہتے ہیں۔ دولت بڑی اچھی چیز ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ دشمن کی دولت بھی اچھی چیز ہے بلکہ مطلب یہ ہوتاہے کہ میرے لئےاور میرے دوستوں کےلئے دولت بڑی اچھی چیز ہے اور جب وہ کہتے ہیں صحت بڑی اچھی چیز ہے تو اس کے معنے بھی یہ نہیں ہوتے کہ میرے دشمن کی صحت اچھی چیز ہے بلکہ مطلب یہ ہوتاہے کہ میرے لئے صحت بڑی اچھی چیز ہے ورنہ دشمن کے متعلق توانسان یہی چاہتاہے کہ وہ نادار اور کمزور ہو۔ اسی طرح جب لوگ عزت و رتبہ کے متمنی ہوتے ہیں تو ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ محض اپنے لئے۔ پس جب دنیا کایہ حال ہے توخالی امن کی خواہش بھی فساد کاموجب ہوسکتی ہے کیونکہ جولوگ بھی امن کے متمنی ہیں وہ اس رنگ میں امن کے متمنی ہیں کہ صرف انہیں اور ان کی قوم کو امن حاصل رہے۔ ورنہ دشمن کے لئے وہ یہی چاہتے ہیں کہ اس کے امن کو مٹادیں۔ اب اگر اسی اصل کو رائج کردیاجائے تودنیا میں جو بھی امن قائم ہوگا وہ چند لوگوں کا امن ہوگا۔ ساری دنیا کا نہیں ہوگا اور جو ساری دنیا کاامن نہ ہو وہ حقیقی امن نہیں کہلا سکتا۔ حقیقی امن تبھی پیدا ہوسکتا ہے جب انسان کو یہ معلوم ہو کہ میرے اوپر ایک بالا ہستی ہے جو میرے لئے ہی امن نہیں چاہتی بلکہ سارے ملکوں کے لئے امن چاہتی ہے اور اگر میں صرف اپنے لئے یاصرف اپنی قوم کے لئے یاصرف اپنے ملک کے لئے امن کامتمنی ہوں تو اس صورت میں مجھے اس کی مدد اس کی نصرت اوراس کی خوشنودی کبھی حاصل نہیں

ہوسکتی۔جب یہ عقیدہ دنیا میں رائج ہوجائے تبھی امن قائم ہوسکتاہے ورنہ نہیں۔ پس اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ کہہ کر قرآن کریم نے انسانی ارادوں کو پاک و صاف کردیا اوریہ تسلیم شدہ بات ہے کہ جب تک ارادے درست نہ ہوں اس وقت تک کام بھی درست نہیں ہوسکتا۔دنیا میں اس وقت جتنے فساد اور لڑائیاں ہیں سب اسی وجہ سے ہیں کہ انسانوں کے ارادے صاف نہیں۔ وہ منہ سے جو باتیں کرتے ہیں ان کے مطابق ان کی خواہش نہیں اور ان کی خواہشات کے مطابق ان کے اقوال اور افعال نہیں۔ آج سب دنیا کہتی ہے کہ لڑائی بُری چیز ہے لیکن اس کا مطلب صرف یہ ہوتاہے کہ اگر ہمارے خلاف کوئی لڑے تویہ بُری بات ہے لیکن اگر ان کی طرف سے جنگ کی ابتداہو تو یہ کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی اوریہ نقص اسی وجہ سے ہے کہ لوگوں کی نظر ایک ایسی ہستی پر نہیں جو سلام ہے۔ وہ سمجھتے ہیں جہاں تک ہمارافائدہ ہے ہم ان باتوں پر عمل کریں گے مگر جب ہمارے مفاد کے خلاف کوئی بات آئے گی تواسے رد کردیں گے۔ مگر قرآن کریم میں جوخداتعالیٰ کے نام بتائے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتاہے کہ وہ سب کا خداہے کسی ایک کانہیں۔اوریہی عقیدہ حقیقی امن کی طرف دنیا کولاسکتاہے کہ دنیا کا ایک خداہے جویہ چاہتاہے کہ سب لوگ امن سے رہیں۔ جب ہمارایہ عقیدہ ہوگا تواس وقت ہماری خواہشات خود غرضی پر مبنی نہیں ہوں گی۔ بلکہ دنیا کو عام فائدہ پہنچانے والی ہوں گی اس وقت ہم یہ نہیں دیکھیں گے کہ فلاں بات کا ہمیں فائدہ پہنچتاہے یانقصان بلکہ ہم یہ دیکھیں گے کہ ساری دنیا پر اس کا کیا اثر ہے۔ یوں تودنیا ہمیشہ اپنے فائدہ کے لئے دوسروں کے امن کو برباد کرتی رہتی ہے۔لیکن اس عقیدہ کے ماتحت ایسا کرنے کی جرأت اس میں نہیں ہوگی کیونکہ وہ سمجھے گی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو ایک بالا ہستی مجھے کچل کر رکھ دے گی۔ جیسے ایک بچہ دوسرے کا کھلونا چھین لیتاہے تووہ اپنے لئے امن حاصل کرلیتاہے لیکن اس کے ساتھ ہی

دوسرے کا امن چھینا جاتاہے اور ایک توخوش ہو رہا ہوتا ہے اور دوسرا رو رہا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کیا تم سمجھتے ہو کہ ماں باپ یا استاد اگر وہاں موجود ہوں تو وہ اس کھیل کو جاری رہنے دیں گے؟ وہ کبھی اس کو برداشت نہیں کریں گے۔ بلکہ جس بچہ نے کھلونا چھینا ہو گا اس کا کھلونا واپس لے کر اس کے اصل مالک کو دے دیں گے اورجب و ہ ایسا کرتے ہیں تب بچہ سمجھتا ہے کہ وہ امن جودوسرے کے امن کو برباد کرکے حاصل کیاجاتاہے وہ کبھی قائم رہنے والانہیں ہوتا۔ حقیقی امن وہی ہوتاہے جوایسی صورت میں حاصل ہو جب کہ کسی کے حق کو تلف نہ کیا گیا ہو۔

غرض حقیقی امن اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک ایک بالا ہستی تسلیم نہ کی جائے اوریہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ امن دینے والا ہے صرف اسلام نے ہی پیش کیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ۔

اس کے بعد وہ پیغام ہے جو اس ہستی کی طرف سے آتاہے۔ کیونکہ جب ایک امن قائم رکھنے کی خواہشمند ہستی کاپتہ مل گیا۔ توانسان کے دل میں یہ معلوم کرنے کی بھی خواہش پیداہوجاتی ہے کہ آیا اس نے امن قائم کرنے کا کوئی سامان بھی کیاہے یانہیں۔ کیونکہ اگر اس نے امن قائم کرنے کا کوئی سامان نہیں کیا تویہ لازمی بات ہے کہ اگر ہم خود امن قائم کرنے کی کوشش کریں گے تو اس بات کا امکان ہوسکتاہے کہ بجائے امن کے فساد پیدا کر دیں۔ پس محض امن قائم کرنے کی خواہش انسان کو صحیح راستہ پر قائم نہیں کر سکتی جب تک ایک بالاہستی کی ایسی ہدایات بھی معلوم نہ ہوں جوامن قائم کرنے میں ممد اورمعاون ہوں۔ کیونکہ اگر انسان کو اپنے بالا افسر کی خواہشات کا صحیح علم نہ ہو توانسان باوجود اس آرزو کے کہ وہ اس کے احکام کی اطاعت کرے اسے پوری طرح خوش

نہیں رکھ سکتا۔ پس اگر ہمیں اپنے بالا افسر کی خواہش تومعلوم ہولیکن اس خواہش کو پورا کرنے کاطریق معلوم نہ ہو۔ تب بھی ہماراامن قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ ممکن ہے ہم کوئی اورطریق اختیار کریں اوراس کا منشاء کوئی اورطریق اختیار کرنا ہو۔ پس ہمارے امن کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بالاہستی ہمیں کوئی ایساذریعہ بھی بتائے جو امن قائم کرنے والاہو۔سواس غرض کے لئے جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں اوریہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا اس نے کوئی ایساذریعہ بتایا ہے یانہیں توسورہ بقرہ میں اس کا جواب نظر آتاہے اللہ تعالیٰ فرماتاہے: وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا (بقرہ:126) یعنی یہ جو آسمان پر سلام خدا کی خواہش ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو اس کے لئے ضروری تھا کہ ہم ایک مرکز قائم کرتے جودنیا کوامن دینے والا ہوتا۔ سو ہم نے بیت اللہ کو مدرسہ بنایا۔ یہاں چاروں طرف سے لوگ جمع ہوں گے اور امن کاسبق سیکھیں گے۔ پس ہمارے خدانے صرف خواہش ہی نہیں کی۔ صرف یہ نہیں کہا کہ تم امن قائم کروورنہ میں تم کو سزادوں گا۔ بلکہ اس دنیا میں اس نے امن کا ایک مرکز بھی قائم کردیا اوروہ خانہ کعبہ ہے۔ فرماتاہے۔ یہاں لوگ آئیں گے اوراس مدرسہ سے لوگ امن کاسبق سیکھیں گے۔

پھریہ کہ اس مدرسہ کی تعلیم کیا ہوگی۔ اس کے لئے بھی رسول کریمؐ نے خداسے خبر پاکر اعلان فرمادیا کہ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝١٦ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (مائدہ:16-17) یعنی اے لوگو!تم تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔ تم کو یہ پتہ نہیں تھاکہ تم اپنے خدا کی مرضی کو کس طرح پورا کرسکتے ہو۔اس لئے دنیا میں ہم نے تمہارے لئے ایک مدرسہ بنادیاہے۔ مگرخالی مدرسہ کام نہیں دیتا جب تک کتابیں نہ ہوں۔ پس فرمایا قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ خدا کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور آیا ہے جو محمدؐ

کی ذات ہے اوراس کے ساتھ ایک کتاب مبین ہے۔ ایسی کتاب جو ہر قسم کے مسائل کو بیان کرنے والی ہے۔ پس خداتعالیٰ نے اسلام کے لئے امن کا مدرسہ بھی قائم کردیا۔ امن کا کورس بھی مقرر کردیا اورمدرسِ امن بھی بھیج دیا۔ مدرّسِ امن محمدؐ ہیں ااور امن کا کورس وہ کتاب ہے جو يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِکی مصداق ہے۔ جو شخص خدا کی رضاحاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے چاہیئے کہ اس کتاب کو پڑھے اس میں جس قدر سبق ہیں وہ سُبُلَ السَّلَامِ یعنی سلامتی کے راستے ہیں اور کوئی ایک حکم بھی ایسا نہیں جس پر عمل کرکے انسانی امن برباد ہوسکے۔ ایک بالاہستی کا وجود ہی ہمارے ارادوں کو درست کرتاہے۔ مدرسہ کاقیام ہماری عملی مشکلات کو حل کرنے میں مدد دیتا ہے اور محمدؐ کی ذات اس کتاب کی عملی تفسیر ہے۔ جیسا کہ آپ فرماتے ہیں کہ میرے ذریعہ خداتعالیٰ نے وہ کتاب بھیج دی ہے جس میں وہ تمام تفصیلات موجود ہیں جن سے امن حاصل ہوسکتاہے۔

اب یہ سوال رہ جاتاہے کہ یہ امن جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے کس کے لئے ہے؟ اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتاہے۔ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيۡنَ اصۡطَفٰى (نمل:60) یعنی اے محمد!ؐ تو کہہ دے الحمدللہ سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے دنیا میں امن قائم کر دیا اور انسان کی تڑپ اور فکر کو دور کر دیا اور کہو وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيۡنَ اصۡطَفٰیوہ بندے جو خداتعالیٰ کے پسندیدہ ہوجائیں اور اپنے آپ کو اس کی راہ میں فدا کردیں ان کے لئے بھی امن پیدا ہو جائے گا اوروہ بھی با امن زندگی بسر کرنے لگ جائیں گے۔ یہاں محمدؐ رسول اللہ نے بتایا کہ تمام لوگ جو آپ کی اتباع کرنے والے اور آپ کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے والے ہیں ان کے لئے کامل امن ہے اور وہ اپنی زندگی کے کسی حصہ میں بھی بدامنی نہیں دیکھ سکتے۔

پھر سوال پیدا ہوتا تھا کہ جب خدا سلام ہے تواس کی طرف سے امن ساروں کے لئے آناچاہیئے۔ نہ کہ بعض کے لئے۔ کیونکہ اگر خالی اپنوں کے لئے امن ہو تو یہ کوئی کامل امن نہیں کہلاسکتا۔ اس کا بھی اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں جواب دیتاہے۔ فرماتاہے۔ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٩﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ۭ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (زخرف:89-90) یعنی محمدؐ رسول اللہ ایک ایسی تعلیم لے کر آئے ہیں جو ساروں کے لئے ہی امن کاموجب ہے اورہر شخص کے لئے وہ رحمت کا خزانہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہے۔ مگر افسوس کہ لوگ اس کو نہیں سمجھتے۔ بلکہ وہ اس تعلیم کے خلاف لڑائیاں اورفساد کرتے ہیں جو ان کے لئے نوید اورخوشخبری ہے یہاں تک کہ محمدؐ کو بھی یہ کہنا پڑا کہ خدایا! میں اپنی قوم کی طرف امن کا پیغام لے کر آیا تھا مگر اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ یہ قوم جس کے لئے میں امن کاپیغام لایاتھا یہ تومجھے بھی امن نہیں دے رہی اٰمَنَ کے معنے ایمان لانے کے بھی ہوتے ہیں اور اٰمَنَ کے معنے امن دینے کے بھی ہوتے ہیں (اقرب) قِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ میں اسی امر کا ذکر ہے کہ ہمارا نبی ہم سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ خدایا! باوجودیکہ میں اپنی قوم کے لئے امن کا پیغام لایا تھا وہ اس کی قدر کرنے کی بجائے میری مخالفت پر کمر بستہ ہو گئی ہے یہاں تک کہ ان لوگوں نے میرے امن کو بالکل برباد کر دیا۔ مگر فرمایا۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ۔ ہم نے اپنے نبی سے یہ کہا ہے کہ ابھی ان لوگوں کو تیری تعلیم کی عظمت معلوم نہیں اس لئے وہ غصہ میں آجاتے اور تیری مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں توان سے در گذر کر۔ کیونکہ ہم نے تجھے امن کے قیام کے لئے ہی بھیجا ہے وَقُلْ سَلٰمٌ اور جب تجھ پر یہ لوگ حملہ کریں اور تجھے ستائیں توتویہی کہتا رہ کہ میں تو تمہارے لئے سلامتی لایاہوں فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ عنقریب دنیا کومعلوم ہوجائے گا کہ محمدؐ دنیا کے لئے امن لایا تھا۔ لڑائی نہیں لایاتھا۔ گویا وہ امن جو رسول کریمؐ لائے وہ صرف مومنوں کے لئے ہی امن نہ

رہا۔ بلکہ سب کے لئے امن ہو گیا۔

پھر صرف محمدؐ کو ہی نہیں بلکہ تمام مومنوں کو مخاطب کرکے اللہ تعالیٰ فرماتاہے کہ وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (فرقان:64) وہ جاہل جو اسلام کی غرض و غایت کو نہیں سمجھتے جب مسلمانوں سے لڑناشروع کردیتے ہیں۔ تومومن کہتے ہیں کہ ہم توتمہاری سلامتی چاہتے ہیں چاہے تم ہمارابُراہی کیوں نہ چاہو۔ جب دشمن کہتاہے کہ تم کیسے گندے عقائد دنیا میں رائج کررہے ہو۔ تووہ کہتے ہیں یہ گندے عقائد اوربیہودہ باتیں نہیں۔ بلکہ سلامتی کی باتیں ہیں۔ گویارسول کریمؐ کی لائی ہوئی سلامتی صرف رسول کریمؐ کے لئے ہی نہیں بلکہ مومنوں کے لئے بھی ہے اورصرف مومنوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سلامتی عارضی ہے یامستقل۔ کیونکہ یہ توہم نے مانا کہ السَّلام خدا سے امن لا کر محمدؐ رسول اللہ نے دنیا کو دیا۔ مگر بعض امن عارضی بھی ہوتے ہیں جن کے نیچے بڑی بڑی خرابیاں پوشیدہ ہوتی ہیں جیسے بخار کامریض جب ٹھنڈا پانی پیتاہے تو اسے بڑا آرام محسوس ہوتاہے۔ مگر دومنٹ کے بعد یکدم اس کابخار تیز ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ”آگ لگ گئی“ پھر برف پیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ آرام آگیا مگر یکدم اسے بے چینی شروع ہوجاتی ہے۔ پس سوال ہوسکتاہے کہ محمدؐ رسول اللہ جوامن دے رہے ہیں یہ عارضی ہے یا مستقل؟ اس کاجواب دیتے ہوئے فرماتاہے: وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (یونس:26) کہ دنیا فسادوں کی طرف لے جاتی ہے مگر محمدؐ رسول اللہ کے ذریعہ جو تعلیم دی گئی ہے وہ موجودہ زمانہ ہی کے لئے نہیں۔ بلکہ وہ ایک ایسا امن ہے جو مرنے کے بعد بھی چلتا چلا جاتا ہے اور جو اس دنیا کے بعد ایک ایسے گھر میں انسان کو پناہ دیتاہے جہاں سلامتی ہی سلامتی ہے گویا یہ زنجیر ایک مکمل زنجیر ہے۔ اس کے ماضی میں ایک سلام ہستی کھڑی ہے اس

کے حال میں امن ہے کیونکہ ایک مدرسہ امن جاری ہو گیاہے اور ایک مدرّسِ امن خداتعالیٰ نے بھیج کر امن کا کورس بھی مقرر کردیا اور عملی طور پر ایک ایسی جماعت تیار کردی جو وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا کی مصداق ہے۔ پس اس کے ماضی میں بھی امن ہے اوراس کے حاضر میں بھی امن ہے۔پھر اس کے مستقبل میں بھی امن ہے۔ کیونکہ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِالسَّلٰمِ مرنے کے بعدوہ انسان کو ایک ایسے جہان میں لے جائے گا۔ جہاں سلامتی ہی سلامتی ہو گی۔پس یہ ساری زنجیر مکمل ہو گئی اور کوئی جزو تشنہ تکمیل نہ رہا۔"

(تفسیر کبیر جلدہفتم صفحہ 51 - 55 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

ملائکۃ اللہ کا موضوع بھی ماہرین علم کلام و متکلمین مفسرین کے ہاں ایک اہم موضوع ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ فرشتوں کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

"فرشتے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل وہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے کلام لاتے ہیں۔ دوّم وہ جو اس کلام کو یا قضاء قدر کو دنیا میں جاری کرتے ہیں۔ جو فرشتے کلام الٰہی لانے والے ہوتے ہیں ان کو روح القدس کہتے ہیں۔ خصوصاً کلام لانے والے فرشتوں کاسردار جبرائیل روح القدس کہلاتا ہے۔"

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ 20 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

کیا ہاروت و ماروت فرشتے تھے؟ اس بارہ میں آپ فرماتے ہیں۔

"جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ هَارُوْت و مَارُوْت دو فرشتے تھے جنہوں نے بابل میں آکر لوگوں کو سحر سکھلایا اور اُن کے ایمان کی آزمائش کی وہ قرآن کریم کے مطالب سے آگاہ نہیں۔ ورنہ جب دنیا میں فرشتے نہیں بستے تو فرشتے رسول بن کر کیوں آئیں پس یہ قطعی

طور پر محال ہے کہ بجائے انسان کے فرشتے لوگوں کی ہدایت کے لئے آیا کریں۔ تاریخ پڑھ کر دیکھ لو ہمیشہ رَجُل ہی نبی بن کر آیا ہے۔ نہ کبھی عورت نبی بنی ہے اور نہ ہی کبھی کوئی غیر انسان نبی ہو کر آیا ہے۔

پس یا تو اس کے یہ معنے کرنے پڑیں گے کہ ھارُوْت و مَارُوْت دونوں ملکوتی صفات انسان تھے جیسے حضرت یوسفؑ کے متعلق آتا ہے کہ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ اور یا یہ ماننا پڑے گا کہ اگر وہ واقعی فرشتے تھے تو وہ دو نبیوں پر اُترے تھے نہ کہ عام لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے کیونکہ جیسا کہ قرآن کریم کی آیت قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ (بنی اسرائیل:96) سے ظاہر ہے فرشتے مُطْمَئِنِّيْنَ کی طرف آیا کرتے ہیں یعنی ان لوگوں کی طرف جو نیک اور پاک اور خدا رسیدہ ہوں۔ بدیوں سے کلی طور پر اجتناب کرنے والے ہوں۔ ہر قسم کے رزائل سے محفوظ ہوں اور الٰہی انعامات اور برکات کے مورد ہوں۔ مُطْمَئِنِّيْنَ کی یہ وہ تعریف ہے جو قرآن کریم نے اس آیت میں بیان کی ہے يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۸﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۹﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۳۰﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (فجر: 28-29) پس مُطْمَئِنِّيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو نفس مطمئنہ رکھنے والے ہوں۔ یہ مراد نہیں کہ اطمینان سے زمین میں کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے ہوں اور لڑائیوں سے اجتناب کرتے ہوں اور درحقیقت ایسے ہی لوگوں پر ملائکہ کلامِ الٰہی لے کر نازل ہوتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ کفار پر ملائکہ نازل ہوئے ہوں اور اُنہیں اللہ تعالیٰ کے پیغامات پہنچائے گئے ہوں۔"

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ 66 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

مناظراتی منہج / مناظرانہ رجحان

یہ خاص اسلوب برصغیر میں تب رائج ہوا جب انیسویں صدی کے آواخر میں ہندوستان مذاہب کا اکھاڑا بن چکا تھا۔ مختلف تحریکیں جنم لے چکی تھیں، جن میں ایک طرف عیسائی زور و شور سے اپنے مذہب کا پرچار کرتے ہوئے Christ for Asia کا نعرہ بلند کر رہے تھے اور ہندو احیائیت کی تحریک آریہ سماج کے سرغنہ پنڈت سوامی دیانند سرسوتی (1827ء تا 1883ء) نے بھی اسلام پر حملوں کا ایک بازار گرم کئے رکھا تھا۔ اس وقت اسلام کے مخالف علماء کو جواب دینے اور اسلام کے پاکیزہ چہرہ پر سے یہ داغ مٹانے اور اسلام کا خوبصورت چہرہ دنیا کو دکھانے کے لئے یہ اسلوب یا رجحان علم تفسیر میں بھی در آیا۔

اس منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر میں سے معروف تفاسیر کو مثال کے طور پر پیش کیا جائیگا۔

مناظراتی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

برصغیر میں اس منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

- تفسیر فتح المنّان المعروف بہ تفسیر حقانی از مولانا عبدالحق حقانی (1850ء تا 1916ء)
- تفسیر القرآن بکلام الرحمن(عربی) از مولوی ثناء اللہ امرتسری (1868ء تا 1948ء)
- تفسیر القرآن (عربی) از مولوی ثناء اللہ امرتسری (1868ء تا 1948ء)
- تفسیر ثنائی از مولوی ثناء اللہ امرتسری (1868ء تا 1948ء)

تفسیر کبیر میں مناظرانہ منہج کی چند مثالیں

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ صاحب نے جماعت احمدیہ کی جانب سے پیش کردہ تفاسیر کی ایک اصل یہ بھی بتائی۔

”ہماری کتب میں یورپین لوگوں کے زہریلے اثرات کا دفاع زیادہ مدنظر ہوتا ہے اور وہ ایسی لغات پر کم یقین رکھتے ہیں جو تفسیری رنگ رکھتی ہیں۔اس لئے ان کے خیال سے میں زیادہ تر ایسی لغات کا حوالہ دیتا ہوں جو خالصاً ادبی ہوں اور خصوصاً جن کے مصنف مسیحی ہوں یا یوروپین لوگوں یامغرب زدہ لوگوں کے لئے محل انکار باقی نہ رہے۔“

(تفسیر کبیر جلد دہم صفحہ 352 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

درود شریف کی دعا کی برکات کو کھولتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں

”آجکل اسلام کے خلاف سب سے بڑا فتنہ عیسائیت کاہے اور عیسائیت اس بات کی مدعی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے تھے پس درود میں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ سے خدا یہ جتنی ترقیاں عیسائیت کو مل رہی ہیں یہ حضرت ابراہیمؑ کے ان وعدوں کی وجہ سے ہیں جو تو نے ان سے کیے تھے۔ ہم تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ ابراہیمی وعدوں کی وجہ سے اس کی ایک شاخ جو اسحاقؑ سے تعلق رکھتی تھی اس پر جو تو نے فضل نازل کئے ہیں اس سے بڑھ کر اسمٰعیلؑ کی نسل یعنی محمدؐ اور آپ سے تعلق رکھنے والوں پر فضل نازل فرما۔ اگر اللہ تعالیٰ ادھر سے اپنی برکتیں ہٹالے اور ان کا رخ اسمٰعیلؑ کی نسل کی

طرف پھر دے تو عیسایت ایک دن میں ختم ہوجاتی ہے پس یہ ایک عظیم الشان دعاہے جو اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کے لئے سکھائی گئی ہے اور پھر یہ ایک ایسی دعا ہے جس میں دنیا کے ہر ملک اور ہر علاقے کامسلمان شامل ہے گویا یہ ایسی کامل دعا ہے کہ نہ آقا اس سے باہر رہتاہے اور نہ امت محمدیہ کا کوئی فرد باہر رہتاہے آجکل یورپین اقوام کو جو طاقت حاصل ہے یہ صرف ان وعدوں کی وجہ سے جو اسحاقؑ کی نسل سے کئے گئے تھے اگر اب اسماعیلؑ کی نسل سے اس کے وعدے پورے ہونے شروع ہوجائیں تو عیسائیت اس طرح ختم ہوجائے گی جس طرح محمدؐ کے آنے پر حزقیل، یرمیاہ، یسعیاہ اور یحییٰ وغیرہ ختم ہوگئے ہیں اور اسلام کو وہ شوکت حاصل ہوجائے گی جو مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہے۔"

(تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ534 - 535 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

آپ الوہیت مسیح کے عقیدہ کے بارہ میں لکھتے ہیں

"پس اگر مسیحؑ آسمان پر جانے کی وجہ سے خدایا خدا کا بیٹا کہلا سکتاہے تو ادریسؑ کی الوہیت کا بھی مسیحی دنیا کو اقرار کرنا چاہئے کیونکہ بائبل کی رو سے وہ بھی آسمان پر اٹھایا گیا تھا۔ بہر حال ادریس ایک ایساوجود ہے جس کے ذریعہ مسیحی دنیا کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے جس پر مسیح کی الوہیت کی بنیاد رکھی گئی ہے یعنی مسیح کا آسمان پر زندہ چلے جانا اور صرف یہی ایک حصہ تھا جس کی ابھی تک تردید نہیں ہوئی تھی۔باقی سب باتوں کی خداتعالیٰ نے تردید کردی تھی مگر عیسائیوں کے اس خیال کی ابھی تردید باقی تھی کہ مسیح آسمان پر چلا گیا ہے اور یہ ایک ایسی بات تھی جو پہلے کسی نبی میں تسلیم نہیں کی جاتی۔ نہ زکریاؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ یحییٰؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ

وہ آسمان پر گئے نہ ابراہیمؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ موسیٰؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے ہیں نہ ہارونؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ اسماعیلؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے۔صرف ادریسؑ کے متعلق کہا جاتاہے کہ وہ آسمان پر گئے اور روایات کے مطابق جس شان سے ادریسؑ کا آسمان پرجانا بتایا گیا ہے اس شان سے مسیح کا بھی آسمان پر جا ناثابت نہیں۔ پس وَاذۡکُرۡ فِی الۡکِتٰبِ اِدۡرِیۡسَ ۫ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا وَّرَفَعۡنٰہُ مَکَانًا عَلِیًّا میں بتایا کہ مسیح کے متعلق تم کہتے ہو کہ وہ آسمان پر گیا۔ ہم تمہارے سامنے ادریسؑ کو پیش کرتے ہیں۔ادریسؑ کے حالات مسیح کے حالات سے زیادہ بہت شاندار ہیں پس اگر ان حالات کی وجہ سے جو مسیح کو پیش آئے وہ الوہیت میں شریک ہوسکتاہے تو ادریس اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے خداتعالیٰ کی الوہیت میں شریک قرار دیاجائے۔

قرآن کریم میں بھی مسیح کے متعلق تو صرف اتناہی آتاہے کہ رَفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ (نساء:159) خدا نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا مگر ادریس کے متعلق فرماتاہے کہ رفعنہ مکاناعلیا ہم نے اسے ایک بلند مقام پر اٹھالیا چنانچہ معراج کی حدیث میں بھی آتاہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت مسیح کو دوسرے آسمان پر اور ادریسؑ کو چوتھے آسمان پر دیکھا۔ گویا وہ مسیح سے بھی اونچا اٹھایا گیا۔ پس اگر ان الفاظ پر بنیاد رکھتے ہوئے تم مسیح کو خدا قرا دیتے ہو تو ادریسؑ کو کیوں خدا قرار نہیں دیتے۔‘‘

(تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ 313۔ 314 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

آپ آریہ سماج کے ایک عقیدہ کا قرآنی آیت سے ردّ کرتے ہوئے، سورت النحل کی

آیت 4 کی تفسیر میں فرماتے ہیں:" تَعالیٰ عَمَّایُشْرِکُوْنَ فرمایا کہ جوانسان آسمان اور زمین کو بالحق نہیں مانتا۔وہ لازماً مشرک بنتا ہے۔ کیو نکہ کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس جہان کوخدانے بنایا ہے مگراس میں مقصد کوئی مقرر نہیں کیا۔ کیو نکہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا ہے توضرور اس کا کوئی مقصد ہے اوراگر اس کا کوئی مقصد نہیں۔ تو یقینا خدا نے نہیں بنایا۔ بلکہ یہ خودبخود ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ ذرّہ ذرّہ خدا کاشریک ہے۔ دوسرے معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ زمین و آسمان کابنانا حق کے ساتھ ہے۔ یعنی ان کا مادہ ہمارا پیدا کردہ ہے۔ اس لئے اس میں تصرف کاہم کو حق حاصل ہے۔اس میں ان لوگوں کاردّ ہے جو ایک طرف خداتعالیٰ کو مادہ کا خالق نہیں سمجھتے۔ دوسری طرف اس کی ترکیب کا فاعل خداتعالیٰ کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ جو خالق نہیں۔ اُسے کیا حق حاصل ہے کہ س میں تصرف کرے اور ایک موجود بالذات کو اپنے حکم کے نیچے لائے یہ توظلم ہوجاتا ہے اور نیز یہ عقیدہ مشرکانہ بھی ہے کہ خداتعالیٰ کے ساتھ ان گنت وجودوں کو ازلی قرار دیا گیا ہے۔"

(تفسیر کبیر جلد چہارم صفحہ 128 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

قرآن کریم میں اللہ کی صفت رحمانیت کا مضمون کھولتے ہوئے اس سے تمام مذاہب باطلہ کا ردّ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"پس اِنِّیٓ اَخَافُ اَنْ یَمَسَّکَ عَذَابٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ کے یہ معنے ہیں کہ میں ڈرتاہوں کہ تجھ پر وہ عذاب نازل نہ ہوجو رحمانیت کی صفت کی وجہ سے نازل ہوتاہے۔ تمہیں خدا نے مالک بنایا تھا پتھروں کا، تمہیں خدا نے مالک بنایا تھا آگ کا، تمہیں خدانے مالک بنایا تھا ہوا کا، تمہیں خدانے مالک بنایا تھا پانی کا، اور یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو خدا تعالیٰ نے اپنی رحمانیت کی وجہ سے تم کو دیں مگرانہیں چیزوں کو تم نے اس کا شریک بنالیا۔

دنیا میں جس قدر بت پائے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے رحمانیت کے ماتحت آتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کو خداتعالیٰ نے بھیجا اور اس لئے بھیجا کہ وہ اس کے بندوں کی خدمت کریں مگر لوگوں نے انہی کو خدا کا بیٹا بنا لیا تو شرک ہمیشہ رحمانیت کی صفت کے انکار کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے ہندو اور عیسائی خدا تعالیٰ کو رحمن نہیں مانتے۔ ہندوؤں نے جب اپنی تعلیم پر غور کیا تو انہیں ماننا پڑا کہ خدا روح اور مادہ کا خالق نہیں۔ اگر وہ اسے خالق مانیں توساتھ ہی اسے رحمن بھی ماننا پڑے گا اور رحمان ماننے سے ہندو مذہب ختم ہوجاتا ہے۔ اسی طرح عیسائی خدا تعالیٰ کو رحمن مانیں تو انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ شریعت لعنت نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا تقاضا ہے کہ اس کی طرف سے ہدایت آئے اور جب شریت لعنت نہیں بلکہ اس پر عمل کرکے انسان نجات پاسکتاہے تو کفارہ کا انکار کرنا پڑا۔ کفارہ کے انکار سے مسیح کی ابنیت ختم ہو گئی اور جب مسیح کی ابنیت ختم ہو گئی تو عیسائیت بھی فنا ہو گئی۔“

(تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ 278 - 279 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

”مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر یورپ کے سامنے ہمیں اپالوجی APOLOGY کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ کھلے اور واضح الفاظ میں مغرب کی برائی اس پر ظاہر کرسکیں۔ سید امیر علی صاحب نے اپنی کتب میں یورپین مصنفین کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے مگر انہوں نے سب جگہ اپالوجی سے کام لیا ہے اور کہاہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یورپین مصنفین کے اسلام کے خلاف اعتراضات درست ہیں مگر ہماری التجا صرف اس قدر ہے کہ اسلام کے متعلق زیادہ سخت رائے قائم نہ کی جائے کیونکہ اسلام ایسے زمانہ میں آیا تھا جب دنیا ابھی ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے تھی۔

اس لئے اس کے کئی مسائل موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہوسکتے۔ لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپالوجی کو بالکل ردّ کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں یورپین لوگوں پر ان کی گمراہی ثابت کی ہے اور بتایا ہے کہ اسلام نے جو کچھ کہا ہے اس کا ایک ایک حرف درست ہے۔ اس پر اعتراض کرنا خود اپنی حماقت کا ثبوت بہم پہنچانا ہے۔ چنانچہ آج تک ہم دشمنوں کی طرف سے اسی وجہ سے گالیاں کھاتے ہیں کہ ہم نے آریوں پر بھی اعتراضات کئے۔ ہم نے ہندوؤں پر بھی اعتراضات کئے۔ ہم نے سکھوں پر بھی اعتراضات کئے۔ ہم نے عیسائیوں پر بھی اعتراضات کئے۔ ہم نے جینیوں اور بدھوں پر بھی اعتراضات کئے۔ ہم نے زرتشتیوں پر بھی اعتراضات کئے۔ ہم نے یہودیوں پر بھی اعتراضات کئے۔ غرض کوئی مذہب اور فرقہ ایسا نہیں جس کی اسلام کے مقابلہ میں ہماری طرف گمراہی ثابت نہ کی گئی ہو اور ہم نے ان پر ایسے وزنی اعتراضات نہ کئے ہوں کہ جن کا جواب دینا ان کے لئے بالکل ناممکن ہے۔ مگر بجائے اس کے کہ مسلمان ہمارے اس کام کی قدر کرتے انہوں نے الٹا ہمیں گالیاں دینا شروع کردیا اور کہنے لگے کہ ہم اسلام کے خلاف غیر مسلموں کو اشتعال دلارہے ہیں۔ چنانچہ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے مظہر علی صاحب اظہر کا ایک رسالہ میں نے دیکھا جس میں انہوں نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ آریوں نے اگر اسلام اور محمدؐ رسول اللہ کو گالیاں دیں تو اس کی بڑی وجہ مرزا صاحب نے آریوں پر اعتراضات کرنے شروع کردیئے تھے۔ اگر وہ اعتراضات نہ کرتے تو آریہ بھی اسلام کی مخالفت نہ کرتے۔ گویا دوسرے الفاظ میں مظہر علی صاحب اظہر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مرزا صاحب کو دشمن کے مقابلہ میں اپالوجی کرنی چاہئے تھی۔ بجائے اس کے کہ اس کے اعتراضات کے جواب دیتے کہتے کہ خدا کے واسطے آپ ہم پر سختی نہ کریں۔ محمدؐ رسول اللہ تو نعوذ باللہ ایک جاہل امت کے سردار تھے وہ موجودہ زمانہ کے مسائل کو کہاں

سمجھ سکتے تھے یا قرآن کریم کی تعلیم نعوذ باللہ موجودہ زمانہ میں کام نہیں آسکتی۔ یہ تو صرف عرب کے لئے مخصوص تھی۔ موجودہ زمانہ میں مغربی علوم ہی لوگوں کو اعلیٰ مقام تک پہنچاسکتے ہیں۔ مگر چونکہ مرزا صاحب نے ایسا نہیں کیا بلکہ انہوں نے کھلے طور پر کہا کہ محمدؐ رسول اللہ سب انبیاء سے افضل ہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم دنیا کی تمام تعلیموں سے اعلیٰ ہے۔ جاہل اور احمق وہ لوگ ہیں جو آپ پر اعتراضات کرتے ہیں اور قرآنی تعلیم کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اس لئے بقول مظہر علی صاحب آریوں کو جوش آ گیا اور وہ اسلام کا مقابلہ کرنے لگ گئے۔ اگر مرزا صاحب ایسا نہ کرتے تو ان کو بھی مقابلہ کا جوش پیدا نہ ہوتا۔ غرض سب مسلمانوں کے دلوں میں آج امید بالکل مٹ چکی ہے۔ صرف ہماری جماعت ایسی ہے جو اپنے اندر ایک پرامید دل رکھتے ہوئے مغرب کی گمراہی ثابت کررہی ہے اور یقین رکھتی ہے کہ مغرب اس کے مقابلہ میں کبھی جیت نہیں سکتا۔"

(تفسیر کبیر جلد نہم صفحہ 561 - 562 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

(روزنامہ الفضل آن لائن ایڈیشن مطبوعہ 27 ستمبر 2022ء لندن)

قسط 4

مسلکی منہج / رجحان

اس اسلوب اور منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر برصغیر میں کثرت سے ملتی ہیں۔اس تفسیری توسّع کے بارہ میں ڈاکٹر عبیدالرحمٰن محسن اور ڈاکٹر حافظ محمد حماد اپنے تحقیقی مقالہ میں اس کے بارہ میں لکھتے ہیں۔

”برصغیر میں تفسیر قرآن مجید پر وقیع اور وسیع علمی مواد موجود ہے۔اس لحاظ سے یہاں کے تفسیری رجحانات میں کئی لحاظ سے اس درجہ توسع ہے کہ شائد اس طرح کا توسع عالم عرب میں بھی موجود نہیں۔“

(بحوالہ برصغیر میں قرآن فہمی کے رجحانات اور اثرات ڈاکٹر عبیدالرحمٰن محسن، ڈاکٹر حافظ محمد حماد القلم، جون 2018ء صفحہ 54)

اس اسلوب کو مدنظر رکھتے ہوئے، مختلف الخیال اور مختلف العقیدہ علماء نے اپنی تفاسیر میں اپنے اپنے مسلک و مذہب کاہی پرچار کیا اور اس کو درست قرار دیا۔اور دوسرے مسالک کو قابل تنقید و مؤاخذہ قرار دیا۔

اس منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر میں سے معروف تفاسیر مندرجہ ذیل ہیں۔

مسلکی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

- تنزیہ القرآن عن المطاعن للقاضی عبدلجبار (معتزلہ) (359ھ تا 415ھ)
- الکشاف عن حقائق التنزیل و عیون الاقاویل فی وجوہ التاویل للزمخشری (معتزلہ) (467ھ تا 538ھ)

- مجمع البیان لعلوم القرآن لابی علی الفضل بن الحسین بن الفضل الطبری الطبرسی (شیعہ) (469ھ تا 548ھ)
- الصافی فی تفسیر القرآن الکریم لملا محسن الکاشانی (شیعہ) (950ھ تا 1009ھ)

برصغیر میں مسلکی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

- تفسیر خزائن العرفان از مولانا نعیم الدین مراد آبادی (بریلوی) (1887ء تا 1948ء)
- تفسیر اشرف التفاسیر (تفسیر نعیمی) از مفتی احمد یار نعیمی (بریلوی) (1894ء تا 1917ء)
- تفسیر بیان القرآن از مولانا اشرف علی تھانوی (دیوبندی) (1863ء تا 1943ء)
- تفسیر احسن البیان از حافظ صلاح الدین یوسف (اہلحدیث) (1945ء تا 2020ء)

تفسیر کبیر میں احمدی علم کلام کے منہج کی چند مثالیں

اس سے قبل کے ہم اس منہج کی مثالیں دیں، یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور آنحضرتؐ کی پیشگوئیوں کے مطابق سیدنا حضرت اقدس مسیح موعودؑ نے احیائے دین اور اقامت شریعت کے لئے آنا تھا اور آپ نے اسلام کی ایسی تعبیر پیش کی کہ جو ہر مسلک سے اوپر تھی، ہر مذہبی سلسلہ سے آزاد تھی۔ وہی اسلام جس کو حضرت محمدؐ رسول اللہ دنیا میں لائے تھے۔ اب اس تعلیم کو اپنی تفسیر میں بیان کرنے کو اگر کوئی مسلکی تفسیر سے تعبیر کرے تو یہ اس کو اس کی سمجھ بوجھ پر محمول کرنا چاہیئے۔ اسی لئے ہم نے

یہاں ”مسلکی“ مثالیں پیش کرنے کے بجائے جماعت کے علم کلام کی مثالیں پیش کرنے پر اکتفاء کیا۔

اس منہج کی اصل بیان کرتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی بیان فرماتے ہیں۔

توحید

”اسلام توحید کے جس بلند ترین مقام پر بنی نوع انسان کو پہنچانا چاہتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان نہ تو کسی کو خداتعالیٰ کا شریک فی الجوہر سمجھے۔ نہ کسی کو اس کے کام میں شریک قرار دے خواہ اس کی عبادت کی جائے یا نہ کی جائے۔ نہ غیر اللہ میں سے کسی کی پرستش کی جائے اور نہ خدا اور اس کے انبیاء کے احکام کے خلاف کسی کی اس طرح اطاعت کی جائے جس طرح خداتعالیٰ کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ تمام چیزیں توحید حقیقی کے منافی ہیں۔“

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ 326 مطبوعہ قادیان 2021ء)

توحید کے قیام کی کوششیں کرنے والوں (جماعت احمدیہ) کو ہی کافر قرار دیا جاتا ہے، اس بارہ آپ فرماتے ہیں۔

”شرک کی انتہائی برائی بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتاہے کہ تم نے ایک ایسا کام کیا ہے جو فطرت صحیحہ کے خلاف ہے اور جس کے متعلق اپنی ناپسندیدہ گی کے جذبات کے اظہار سے کوئی شریف آدمی رک نہیں سکتا۔یہ کسی فعل کی حددرجہ کی ناپسندید گی کا ثبوت ہوتاہے کہ اس کے خلاف ہر انسان بے تحاشا احتجاج کرنے پر تیار ہوجائے اور اسے کسی

صورت میں بھی برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہو۔اس میں بتایا گیا ہے کہ شرک ایک ایسا فعل ہے جس کو ماننے سے فطرت انکار کرتی ہے اور یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب عیسائیت اسلام کے اعتراضات سے ڈر کر خود تثلیث کے اور معنے کرنے لگ گئی ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ خداتعالیٰ تو کہتاہے کہ اس کے خلا ف ہر انسان کو آواز اٹھانی چاہیئے مگر اس زمانہ میں جو لوگ اس فتنہ کے خلاف آواز اٹھار ہے ہیں اور خداتعالیٰ اور خداتعالیٰ کی توحید کے قیام کے لئے رات دن کوششیں کررہے ہیں وہی مسلمان کہلانے والوں کی نگاہ میں کافراور بے دین اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ وہ عیسائیوں کے ساتھ جو مسیح کو خدا کاشریک قرار دیتے ہیں تو محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں مگر جو توحید کے قیام کے لئے عیسائیوں کو تبلیغ کرتے ہیں ان کو کافر قرار دیتے ہیں۔“

(تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ 379 - 380 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

آنحضرتؐ حقیقی نجات دہندہ

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران:32) اے محمد رسول اللہؐ! تو لوگوں سے یہ کہہ دے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اس قدر روحانی ترقی حاصل کرو کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ تو میری اطاعت کرو اور میری بیعت میں شامل ہو جاؤ نتیجہ یہ ہو گا کہ نہ صرف تم نجات پا جاؤ گے بلکہ خدا تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے۔ گویا محمدؐ رسول اللہ پر ایمان لانے سے انسان کو صرف نجات ہی نہیں ملتی بلکہ وہ اس قدر روحانی ترقی حاصل کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔“

(تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ58 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

مقام ختم نبوت

"سب سے بڑا معجزہ جو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمدؐ رسول اللہ کو عطا فرمایا ہے وہ آپ کا خاتم النبیین ہونا ہے یعنی تمام کمالات نبوت آپ پر ختم کر دیئے ہیں۔"

(تفسیر کبیر جلد دہم صفحہ276 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

قرآن کریم

"نبأعظیم کا لفظ قرآن کریم پر چسپاں ہو جاتا ہے اس لئے قرآن کریم یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں ساری خوبیوں کا جامع ہوں بلکہ گزشتہ تمام انبیاء کی کتابیں میرے اندر جمع ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البیّنة:4) پس اگر نوحؑ کے صحف نَبَأ تھے۔ اگر ابراہیمؑ کے صحف نَبَأ تھے۔ اسی طرح اگر عیسیٰؑ کا کلام نَبَأ تھا۔ اگر کرشن کا کلام نَبَأ تھا۔ اگر رامچندر کا کلام نَبَأ تھا۔ اگر زرتشتؑ کا کلام نَبَأ تھا تو جس کلام میں یہ سارے ہی جمع کر لئے گئے ہوں وہ یقیناً نَبَأ عظیم کہلائے گا۔"

(تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ6 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

"یہ قرآن ہی تھا جس نے ابو بکر کو ابو بکرؓ، عمر کو عمرؓ، عثمان کو عثمانؓ اور علی کو علیؓ بنایا۔ بے شک ان لوگوں نے بڑی قربانیاں کیں۔ بے شک ان لوگوں نے دین کی بڑی خدمتیں کیں مگر یہ سب ہماری صفتِ رحمانیت کا نتیجہ تھا۔ یہ سب قرآن کا نتیجہ تھا۔ پس گو ہم تمہارے لئے جزاء کا لفظ استعمال کر رہے ہیں مگر اس بات کو بھول نہ جانا کہ یہ محض ہماری صفت رحمانیت کا نتیجہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اَلرَّحْمٰنُ ﴿۲﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿۳﴾ (الرحمن:2-3) کہ اگر رحمن خدا کی طرف سے قرآن نازل نہ ہوتا۔ اگر اس کی طرف سے تم پر یہ علوم اور معارف کھولے نہ جاتے تو تم کو وہ مقام کبھی حاصل نہ ہو سکتا جس پر تم آج پہنچے ہوئے ہو۔“

(تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ59 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

”حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا کوئی حصہ منسوخ نہیں اس کا ایک ایک لفظ قابلِ عمل ہے اور یہ قیامت تک قائم رہنے والی شریعت ہے۔ میں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ میں کسی کو کہتا ہوں کہ قرآن کریم کا ہر لفظ اور ہر زبر اور ہر زیر اپنے اندر معنے رکھتی ہے اور قرآن کریم میں چھوٹے چھوٹے فرق سے اُس کے معنی بدلتے جاتے ہیں اور اس میں جس قدر حکمتیں ہیں کوئی کتاب ان کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ساری حکمتیں ہر شخص پر کھل جائیں۔ ہاں ہر زمانہ میں قرآن کریم کے کچھ نئے معنے کھلتے ہیں اور اُن کے علاوہ کچھ زائد معنے ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے اگلوں کے لئے رکھے ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

جو لوگ قرآن کریم میں نسخ قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کے ثبوت کے طور پر اس قسم کی کوئی دلیل پیش نہیں کرتے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا ہو کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ فلاں آیت منسوخ ہے۔ یا آپؐ نے فرمایا ہو کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ آج رات یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے۔ وہ صرف استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ فلاں آیت کا فلاں آیت کے مخالف مفہوم ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک ناسخ ہے اور دوسری منسوخ۔ گویا جو آیت بھی اُن سے حل نہیں ہوتی اُسے وہ منسوخ قرار دے دیتے ہیں۔اور یہ محض عدم علم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ اِدھر تو وہ یہ کہتے ہیں کہ احاد احادیث

قرآن کریم کو منسوخ نہیں کرتیں اور یہ بات صحیح ہے۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ ایک چھوڑ کروڑ احاداحادیث بھی قرآن کریم کا کوئی حصہ منسوخ نہیں کر سکتیں مگر دوسری طرف وہ اپنے ظن اور قیاس سے کام لے کر قرآن کریم کی آیات کو منسوخ قرار دینے لگ جاتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔"

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ 98 - 99 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

وحی و الہام

"وہ دائمی طور پر مسلمانوں سے یہ وعدہ کرتاہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۱﴾ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۲﴾ (حٰم السجدہ:31) یعنی وہ لوگ جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ استقلال کے ساتھ اس عقیدہ پر قائم ہوگئے وہ اللہ تعالیٰ کے کلام اوراس کے الہام سے نوازے جائیں گے اور خداتعالیٰ کے فرشتے ان پر یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ ڈرو نہیں اور نہ کسی پچھلی کوتاہی کے بدنتائج کا خوف کرو۔ بلکہ اس جنت کے ملنے سے خوش ہوجاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم اس دنیا میں بھی تمہارے دوست ہیں اور آخرت میں بھی تمہارے دوست رہیں گے اوراس جنت میں جو کچھ تمہاراجی چاہے گا وہ تم کو ملے گا اور جو کچھ تم مانگو گے وہ بھی تم کو دیاجائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام ہر مومن کے لئے قرب الٰہی کے دروازہ کو کھلا تسلیم کرتاہے اور وہ بنی نوع انسان کو یقین دلاتاہے کہ اگر وہ سچے دل سے محمدؐ رسول اللہ کی اتباع کریں گے تو خداتعالیٰ انہیں یقیناً اپنا محبوب بنالے گا اور انہیں

اپنے کلام اور الہام سے نوازے گا اور مشکلات میں ان کی مدد کرے گا اورانہیں غیر معمولی کامیابیوں اور برکتوں سے حصہ بخشے گا۔“

(تفسیر کبیر جلد ہفتم صفحہ325 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

اشاری، سلوکی یا صوفیانہ منہج / رجحان

اس اسلوب اور منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر برصغیر میں ملتی ہیں۔ان تفاسیر میں علم تصوف کی روشنی میں آیات قرآنیہ کے نکات و لطائف کا بیان ہوتا ہے۔قرآنی آیات سے سلوک و جذب کے طریق اور روحانی فوائد کا استنباط ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں علماء نے اس طرح کی تفسیر کو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک کو نظری رجحان کہتے ہیں اور دوسرا اشاری فیضی رجحان کہلاتا ہے۔ نظری رجحان میں مختلف نظریات تصوف کو اپنی تفسیر میں دکھایا جاتا ہے جبکہ اشاری فیضی میں نظریات کے بجائے اپنے الہامات اور فیوض کو بیان کیا جاتا ہے۔

اس منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر میں سے معروف تفاسیر مندرجہ ذیل ہیں۔

صوفیانہ منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

- تنبیہ الافھام الیٰ تدبر الکتاب والتعرف علی الآیات والانبآء العظام (المتوفٰی 536ھ)
- لطائف الاشارات لعبد الکریم بن ہوازن قشیری نیشاپوری (986ء تا 1072ء)
- تفسیر القرآن لامام محی الدین ابن عربی (1165ء تا 1240ء)

- روح البیان فی تفسیر القرآن لاسماعیل حقی (1653ء تا 1725ء)

برصغیر میں صوفیانہ منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

- تفسیر کاشف الحقائق و قاموس الدقائق لشیخ محمد بن احمد شریحی مریکلی (المتوفیٰ 684ھ)
- تفسیر مہائمی از شیخ علی بن احمد مہائمی (835ھ)
- تفسیر بیان القرآن از مولانا اشرف علی تھانوی (دیوبندی) (1863ء تا1943ء)
- تفسیر اسرار التنزیل از مولانا محمد اکرم اعوان (متصوف) (1943ء تا2017ء)

تفسیر کبیر میں صوفیانہ طرز کے منہج کی چند مثالیں

تزکیہ نفس

"تزکیہ چونکہ قلب سے تعلق رکھتا ہے اور تلاوت آیت بھی ایمان سے تعلق رکھتی ہے اس لئے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کو لے لیا جو ایمانیات اور روحانیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ معرفت کے لحاظ سے سب سے پہلی چیز یہی ہے کہ انسان کو ایسی آنکھیں عطا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے نشانات کا مشاہدہ کرنے والی ہوں اور دوسری چیز یہ ہے کہ ان نشانات کا مشاہدہ اُن کے اندر ایسا تزکیہ پیدا کر دے کہ اس کا دل خدا تعالیٰ کا عرش بن جائے اور صفات الٰہیہ اس کے آئینہ قلب میں منعکس ہو جائیں۔ جب معرفت کا نور انسانی قلب کو ایسا جلا بخشتا ہے کہ اُس میں کوئی نفسانی قدرت

اور آلائش باقی نہیں رہتی تو اس وقت وہ خدا کی صفات کا مظہر ہو جاتا ہے اور یہی انسانی زندگی کا اصل مقصد ہے۔"

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ278 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

شراب۔۔۔شراب معرفت

"پہلے اللہ تعالیٰ نے اَعْنَاب کا ذکر فرمایا تھا جن سے شراب بنتی ہے۔ اب یہ بتایا کہ وہ مذکورہ بالا شرابِ معرفت میں اتنے متوالے ہوں گے کہ ان کا نشہ کبھی ختم ہی نہ ہو گا اور ان کی طبیعتوں میں کہیں سیری حاصل نہیں ہو گی۔ ایک پیالہ ختم ہو گا تو دوسرا پینا شروع کر دیں گے دوسرا پیالہ ختم ہو گا تو تیسرا شروع کر دیں گے یعنی ایک قربانی لیں گے تو دوسری کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ دوسری قربانی کریں گے تو تیسری کے لئے تیار ہو جائیں گے گویا محبت الٰہی کا پیالہ وہ سیر ہو کر زمین پر رکھیں گے ہی نہیں۔ ہر وقت اُن کا پیالہ بھرا ہوا رہے گا اور عشق الٰہی کے نشہ میں انہیں قربانی کی ایسی عادت پڑ جائے گی کہ کسی موقع پر بھی اُن کی طبیعت میں سیری نہیں ہو گی اور چونکہ اگلے جہاں کی لذتیں روحانی ہوں گی گو یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی ایک جسمانی شکل بھی ہو گی مگر بہرحال چونکہ اصلی لذت روحانی ہو گی اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ان کو ایسے پیالے ملیں گے جو ہمیشہ بھرے رہیں گے اُن میں کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی تو ان الفاظ کو جہاں اگلے جہاں پر چسپاں کیا جاتاہے وہاں اس کے یہ معنے بھی ہوں گے کہ ان کے دل محبت الٰہی سے ہمیشہ لبریز رہیں گے۔ قربانی ان کے قدم کو پیچھے نہیں ہٹائے گی بلکہ ہر قربانی کے بعد ان کا دل چاہے گا کہ ہم اور قربانی کریں اور اپنے عشق کا مظاہرہ کریں اور جب

وہ دوبارہ اپنے عشق کا مظاہرہ کریں گے تو ان کے دلوں میں خواہش پیدا ہو گی کہ ہم اپنے عشق کا اب تیسرا مظاہرہ کریں اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا چلا جائے گا۔“

(تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ 55 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

روحانی سوزش

”جب ابراہیمؑ سے اس زمانہ کے لوگوں نے یہ باتیں سنیں کہ بتوں کی پرستش ترک کردو اورخدائے واحد کی عبادت کرو۔ تو انہوں نے ایک دوسرے کوآپ کے خلاف اکسانا شروع کردیا اور کہا کہ آؤ اوراس کو قتل کر دو یا اس کو آگ میں ڈال کر جلادو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے آگ سے بچالیا۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طریق کاذکر کرتے ہوئے جس سے کام لے کر آپ کو بچا لیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتاہے کہ قُلۡنَا یٰنَارُ کُوۡنِیۡ بَرۡدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ (انبیاء:70) یعنی ہم نے اس وقت آگ سے کہا کہ اے جسمانی آگ! تیرے اندرایک روحانی آگ داخل ہورہی ہے۔ اب تیراکام یہ ہے کہ اس آگ کے مقابلہ میں سرد ہوجا۔ ابراہیمؑ کے دل میں میری محبت کی آگ بھڑک رہی ہے اورمیرے عشق کی آگ کاکوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جس طرح سورج کے مقابل پر شمعیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ اسی طرح میری محبت کی آگ کے مقابلہ میں تیری آگ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ پس ابراہیمؑ کے لئے توسرد ہوجا۔ جس طرح انگارہ کے مقابلہ میں کسی اور گرم چیز کی گرمی کم محسوس ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ ایسی شدید ہے کہ دوسری تمام آگیں اس کے مقابلہ میں سرد پڑ جاتی ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی ایک دفعہ الہام ہواکہ ”آگ سے ہمیں مت ڈراکہ آگ ہماری غلام بلکہ

غلاموں کی غلام ہے۔“

اس کا بھی یہی مفہوم ہے کہ ہمارے دل میں عشق الٰہی کی آگ شعلہ زن ہے۔ اس آگ کے مقابلہ میں ظاہری آگ کی کیاحیثیت ہے۔ ایک گرم توا انسان کے ہاتھ کو توجلادیتاہے مگر انگارے کونہیں جلاسکتا۔ اسی طرح آگ اس شخص کونہیں جلاسکتی جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی آگ بھڑک رہی ہو۔چنانچہ اسی وقت بادل آیا اوربرسا اور وہ آگ ٹھنڈی ہو گئی اوریہ معجزہ دیکھ کراس کی قوم کے بعض لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا ہو گیا اور اس کے لئے سلامتی کے سامان پیداہوگئے۔“

(تفسیر کبیر جلد ہفتم صفحہ 613 - 614 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

تلاش نظم کا ادبی منہج / رجحان

اس اسلوب پر مسلمان علماء و مفسرین کی توجہ کافی کم رہی۔ آیات کا باہم ربط اور سورتوں کا آپس کا تعلق نئے اور عمدہ قرآنی مطالب کی طرف ایماء کرتے ہیں۔یہ رجحان ایک منفرد رجحان ہے۔ اس رجحان کی نمائندہ تفسیر برصغیر میں امین احسن اصلاحی (1904ء تا 1997ء) کی تدبر القرآن ہے۔ قرآن کریم کے نظم و سیاق کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں۔

”نظم کسی کلام کا ایسا جزو لاینفک ہوتا ہے کہ اس کے بغیر کسی عمدہ کلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ قرآن جس کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے اور جو فی الواقع معجزہ ہے بھی ایک بہت بڑے گروہ کے نزدیک نظم سے بالکل خالی

کتاب ہے۔ ان کے نزدیک نہ ایک سورہ کا دوسری سورہ سے کوئی ربط و تعلق ہے اور نہ ایک سورہ کی مختلف آیات ہی میں باہم کوئی مناسبت و موافقت ہے۔ بس مختلف آیات مختلف سورتوں میں بغیر کسی مناسبت کے جمع کر دی گئی ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ ایسا فضول خیال ایک ایسی عظیم کتاب کے متعلق لوگوں کے اندر کس طرح جاگزیں ہو گیا ہے۔۔۔میں نے اس تفسیر میں چونکہ نظم کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ اگر میں اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے کہنا چاہیئے کہ مجھے ایک قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں میں گردش کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔"

تفسیر کبیر میں نظم و ترتیب قرآن کے منہج کی چند مثالیں

اس سے پہلے کہ ہم اس منہج کی کچھ مثالیں پیش کریں، نظم و ترتیب قرآن کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا ایک حوالہ اس ضمن میں پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے واضح ہو گا کہ آپ اس کو تفسیر میں کتنی اہمیت دیتے تھے۔

آپ فرماتے ہیں۔

"(اللہ تعالیٰ) فرماتاہے ہم نے اس وحی کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرکے نازل کیاہے اورسارے قرآن میں ایک اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے۔"

(تفسیر کبیر جلد ہفتم صفحہ464 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

ایک اور جگہ پر قدرے مفصل اس سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

''ہم نے اس قول یعنی قرآن کریم کو ایسا بنایا ہے کہ اس کی ہر آیت دوسری آیت کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اس کے تمام مضامین میں نہایت اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے ترتیب قرآن کے مسئلہ کوہی نظر انداز کر دیا اوریہ کہنا شروع کردیا کہ نعوذباللہ یہ ایک بے جوڑ کلام ہے جس کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ گویا ان کے نزدیک مسلمانوں کویہ توایمان رکھنا چاہیئے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھناچاہئے کہ انسانی کلام میں جویہ خوبی ہوتی ہے کہ اس میں ربط پایا جاتا ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے مفسرین میں سے ابن حیّانؒ کے سوا کسی نے ترتیب کے مسئلہ کی طرف توجہ نہیں کی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قرآن کریم کی فضیلت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے۔ تاکہ لوگ اس پر غور کر کے نصیحت حاصل کریں۔ لیکن یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ الہامی کتابوں کی ترتیب عام کتابوں کی ترتیب سے جداگانہ رنگ رکھتی ہے۔ عام کتابوں میں تویہ ہوتاہے کہ مثلاً پہلے مسائل وضو بیان کئے جائیں گے۔ پھرمسائل عبادت بیان کئے جائیں گے پھر ایک باب میں مسائل نکاح بیان کئے جائیں گے اسی طرح کسی باب میں طلاق و خلع کا اور کسی باب میں کسی اورچیز کا ذکرہو گا۔ مگرالہامی کتابوں میں یہ رنگ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی ترتیب بالکل اَور قسم کی ہوتی ہے۔ جودنیا کی ترتیب سے بالکل نرالی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جاہل لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اس میں کوئی ترتیب ہے ہی نہیں۔

اب سوال پیدا ہوتاہے کہ الہامی کتابوں میں دنیا کی تمام کتابوں سے نرالی ترتیب کیوں رکھی جاتی ہے۔ اس کاجواب یہ ہے کہ اس میں بھی کئی حکمتیں ہیں۔

(الف) اس ترتیب سے سارے کلام سے دلچسپی پیدا کرنی مدنظر ہوتی ہے۔ اگر الہامی کتاب

کی ترتیب اس طرح ہو جس طرح مثلاً ہدایہ کی ترتیب ہے کہ وضو کے مسائل یہ ہیں۔ نکاح کے مسائل وہ، توعام لوگ اپنے اپنے مذاق کے مطابق انہی حصوں کو الگ کرکے ان پر عمل کرنا شروع کر دیتے اور باقی قرآن کو نہ پڑھتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے سارے مسائل کو اس طرح پھیلا کرر کھ دیاہے کہ جب تک انسان سارے قرآن کو نہ پڑھ لے مکمل علم اسے حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔

(ب) لوگوں کو غوروفکر کی عادت ڈالنے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ ترتیب اختیار کی ہے۔ اگر عام کتابوں کی طرح اس میں مسائل بیان کر دیئے جاتے تولوگوں کاذہن اس طرف منتقل نہ ہوتا کہ ان مسائل کے باریک مطالب بھی ہیں۔ وہ صرف سطحی نظر رکھتے اور غوروفکر سے محروم رہتے۔ مگر اب اللہ تعالیٰ نے ان مسائل کو اس طرح پھیلا دیا ہے اورایک دوسرے میں داخل کردیا ہے کہ انسان کو ان کے نکالنے کے لئے غور کرنا پڑتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک سمندر ہے۔

(ج) یہ ترتیب اس لئے بھی اختیار کی گئی ہے۔ تاخشیت الٰہی پیدا ہو۔ مثلاً اگریوں مسائل بیان ہوتے کہ وضویوں کرو اور کلی اس طرح کرو۔ عبادت اس طرح کرو۔ اتنی رکعتیں پڑھو تو خشیت الٰہی پیدانہ ہوتی۔ جیسے عبادت وغیرہ کے تمام مسائل قدوری اور ہدایۃ وغیرہ میں موجود ہیں مگر قدوری اور ہدایۃ پڑھ کر کوئی خشیت اللہ پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن وہی مسئلہ جب قرآن میں آتاہے تو انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی خشیت سے لبریز ہوجاتا ہے اس لئے کہ قرآن ان مسائل کو خشیت اللہ کا ایک جز بنا کر بیان کرتاہے اوردراصل نماز اور روزہ اورحج اور زکوٰۃ وغیرہ مسائل کا اصل مقصد تقویٰ ہی ہے۔ پس قرآن تقویٰ کو مقدم رکھتاہے۔ تاکہ جب انسان کو یہ کہا جائے کہ وضو کروتو وہ وضو کرنے کے لئے پہلے ہی

تیار ہو۔ اسی طرح جب کہاجائے کہ نماز پڑھو تو انسان نماز پڑھنے کے لئے پہلے ہی تیار ہو۔ اگر قرآن میں نماز کا ایک باب ہوتا تو اسے پڑھ کر خشیت اللہ پیدا نہ ہوتی۔

غرض الہامی کتاب چونکہ اصلاح کو مقدم رکھتی ہے اس لئے وہ سطحی ترتیب کوچھوڑ کر ایک نئی ترتیب اختیار کرتی ہے جوجذباتی ہوتی ہے یعنی قلب میں جوتغیرات پیداہوتے ہیں الہامی کتاب ان کاذکر کرتی ہے یہ نہیں کہ وہ وضو کے بعد نماز کا ذکر کرے بلکہ وہ وضو سے روحانیت طہارت اورخداتعالیٰ کے قرب کی طرف انسان کو متوجہ کرے گی۔ کیونکہ وضو سے طہارت کے جذبات پیداہوتے ہیں۔ پھر جب نماز کامسئلہ آئے گاتویہ نہیں ہوگاکہ اللہ تعالیٰ نماز کے مسائل بیان کرناشروع کردے بلکہ سجدہ اور رکوع کے ذکر سے جو جذبات انسانی قلب میں پیداہوتے ہیں ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ تاکہ جو جذبات بھی انسان کے اندر پیداہوں ان سے وہ ایسااثر لے جواسے خداتعالیٰ کے قریب کردے۔ غرض ترتیب قرآن ظاہر پر مبنی نہیں بلکہ قلب کے جذبات کی لہروں پر مبنی ہے۔"

(تفسیر کبیر جلد ہفتم صفحہ 519 - 520 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

"پہلی سورۃ (سورۃ النحل) میں جو بعض باتیں اشارۃً فرمائی تھیں اس سورۃ (سورۃ بنی اسرائیل) میں ان کو واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً پہلی سورۃ میں شہد کے متعلق فرمایا تھا کہ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اوراس سے اشارہ کیاتھا کہ کلام الٰہی میں بھی شفاہے۔ اس سورۃ میں اس مضمون کو بوضاحت بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا

(بنی اسرائیل:83)

یہ سورۃ نزول میں سورۃ نحل سے پہلے ہے۔ مگر مضمون کی ترتیب کے لحاظ سے بعد میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ اس لئے جمع قرآن کے وقت رسول کریمؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسے سورہ النحل کے بعد رکھا۔ میں پہلے بتاچکاہوں کہ سورتوں کے نزول کی ترتیب اور تھی لیکن جمع قرآن کے وقت اس ترتیب کو بدل دیا گیا۔ کیونکہ سارے قرآن کو پڑھتے ہوئے اور بعد میں آنے والوں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسری ترتیب کی ضرورت تھی اوریہ امر قرآن کریم کے زبردست معجزات میں سے ہے۔ اس کی ہر سورۃ الگ الگ مضمون پر مشتمل ہے اور ساتھ ہی اس کے اس کی سورتوں میں زبردست اتصال بھی پایا جاتا ہے۔ جب نزول قرآن کے وقت الگ الگ سورتیں نازل ہورہی تھیں اوراس وقت کی ضرورت مدنظر رکھا جاتا تھا تب بھی پڑھنے والوں کو کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی۔ کیونکہ ہرسورۃ کامضمون مکمل تھا۔ مگرجب بعد میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دوسری ترتیب سے مرتب کیا توپھر علاوہ اس مضمون کے جو الگ الگ سورتوں سے نکلتا تھا ایک اَورسلسلہ مضمون پیدا ہو گیا جس نے قرآنی مضامین کو اور زیادہ وسعت دے دی۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔"

(تفسیر کبیر جلد چہارم صفحہ 278 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

"میرا تجربہ یہی ہے کہ قریبًا ہر سورۃ کا دوسری سورۃ سے تعلق ہوتا ہے اور پھر میرے علم کے مطابق ہر سورۃ کا دوسری سورۃ سے ایک تعلقِ قریب ہوتا ہے اور ایک تعلقِ بعید ہوتا ہے یعنی ایک تعلق تو ایسا ہوتا ہے جو اسے پہلی سورۃ کی آخری آیتوں سے ملا دیتا ہے

لیکن ایک تعلق ایسا ہوتا ہے جو سلسلۂ مضمون سے متعلق ہوتا ہے پھر آگے یہ تعلق دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تعلق تو سورۃ کا قریب کی سورۃ یا اس کے ساتھ کی سورۃ سے ہوتا ہے اور مضمون میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے اور ایک تعلق ایسا ہوتا ہے جو چھ چھ سات سات بلکہ دس دس سورتیں پیچھے جا کر اس سورۃ کو پچھلی سورتوں سے ملا دیتا ہے یہ بھی ایک ایسا مضمون ہے جو خدا تعالیٰ کے فضل سے ایک حد تک میں نے سمجھا ہے۔ سورتوں کے آپس کے قریب کے تعلقات اور تسلسل مضمون کے اعتبار سے اُن کے آپس کے تعلقات بالعموم میں نے اخذ کئے ہیں لیکن مجھ پر اثر یہ ہے کہ سورتوں کا ایک تعلق بعید یا ابعد بھی ہوتا ہے۔“

(تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ 274 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

(روزنامہ الفضل آن لائن ایڈیشن مطبوعہ 14 اکتوبر 2022ء لندن)

قسط 5
تحریکی منہج / رجحان

جن مفسرین نے تحریکی اسلوب کو اپناتے ہوئے تفاسیر لکھیں ان میں مولانا مودودی کا نام آتا ہے، بلکہ مولانا کو اس رجحان کا بانی کہا جاتا ہے۔یہ ایک جدید رجحان ہے۔اس منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر میں سے معروف تفاسیر مندرجہ ذیل ہیں۔

تحریکی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

- تفہیم القرآن از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی (1903ء تا 1979ء)
- نور الاذہان فی تفسیر القرآن از شیخ محمد حسن صلاح الدین (شیعہ تفسیر)

تفسیر کبیر میں تحریکی منہج کی چند مثالیں

”تسابق کی روح کو جب بھی ہم اپنے سامنے لاتے ہیں ہماری روحوں میں ایک پالید گی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے دلوں میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور ہماری دماغوں میں عزم پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے مخالف یا مد مقابل یا رقیب سے کسی صورت میں بھی دیں گے نہیں۔ اسلام اس کی ہر گز اجازت نہیں دیتا کہ ہم نیکیوں کے مقابلہ میں سست ہوں۔ بلکہ نیکی کے میدان میں اپنے باپ اور بھائی سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے..... قرآن کریم نے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ کہہ کر اور ایک جگہ وفَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا فرما کر اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس دنیا میں مقابلہ ہو رہا ہے تمہارا فرض ہے کہ اس مسابقت میں سب سے

آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ ہماری جماعت کو بھی چاہیے کہ ہم میں سے ہر فرد اپنے نفس کو ٹٹولتا رہے اور دین کے ساتھ ایک گہری محبت اور شیفتگی پیدا کرنے کی کوشش کرے اور سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، بس یہی ایک مقصد اپنے سامنے رکھے کہ ہم نے اسلام کو دنیا میں غالب کرنا ہے۔ جب تک یہ روح ہمارے اندر پیدا نہیں ہوتی اُس وقت تک ہم اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ256 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

"فرماتا ہے کَلَّا ہرگز نہیں لَمَّا یَقْضِ مَآ اَمَرَہٗ اُس نے اب تک وہ کام نہیں کیا جس کا اُسے حکم دیا گیا تھا۔ لَمَّا یَقْضِ مَآ اَمَرَہٗ میں اسی طرف اشارہ ہے جس طرف وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰی میں اشارہ کیا گیا تھا اور جس کا قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہٗ میں بھی ذکر تھا۔ کہ انسان کے لئے موقع تھا کہ وہ خداتعالیٰ کے قرب میں بڑھے اور اپنی عاقبت کو سنوار لے مگر اب تک اس نے اپنے اس فرض ادا نہیں کیا۔ اُس کے لئے روحانی ترقیات حاصل کرنے کا بہت بڑا موقع تھا اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے قرب کا میدان کُھلا تھا مگر افسوس کہ اس نے اپنے اس فرض کو کماحقہٗ اب تک سرانجام نہیں دیا۔ یہی وہ چیز ہے جس پر آجکل بار بار زور دے رہا ہوں اور جماعت کو توجہ دلا رہا ہوں کہ وہ آئندہ نسلوں تک اِس امانتِ روحانی کو پہنچانے کے لئے اس قدر تن دہی اور اس قدر جانکاہی سے کام لے کہ شیطان ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جائے اور کفر کے غلبہ کا دنیا میں کوئی امکان نہ رہے۔ آج تک کسی اُمت نے اپنی نسل کو شیطانی حملوں سے محفوظ رکھنے پر زور نہیں دیا اگر ہماری جماعت اس فرض کو سرانجام دے لے تو یقینا یہ ایک بے مثال کام ہو گا اور اس کی نظیر اَور کسی اُمّت میں نہیں مل سکے گی۔ اللہ تعالیٰ اسی نکتہ کی طرف توجہ دلاتا ہے اور افسوس کے ساتھ فرماتا ہے کہ لَمَّا

یَقْضِ مَآ اَمَرَہٗ ہم نے انسان کو جو حکم دیا تھا اس کو اب تک اُس نے ادا نہیں کیا۔ فرداً فرداً لوگوں نے اپنی اصلاح کی بہت کوششیں کی ہیں مگر قوم کی قوم کو اُبھار کر ترقی کے میدان میں اس طرح بڑھاتے چلے جانا کہ پھر اس کے گرنے کا کوئی امکان نہ رہے اور شیطان اُس کو ورغلانے سے مایوس ہو جائے یہ کام اَیسا ہے جس کی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی رسول کریمؐ کی اُمت پر چونکہ مُختلف دَور آتے ہیں اس لئے ممکن ہے رسول کریمؐ کے دَوروں میں سے کوئی دَور ایسا بھی آجائے جس میں اس فرض کی ادائیگی ہو سکے جس کا کَلَّا لَمَّا یَقْضِ مَآ اَمَرَہٗ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اب تک الگ الگ کوششیں کر کے اُن کے نتائج کو دیکھا جا چکا ہے صحابہؓ نے تیس سال کوشش کی مگر پھر اُن کی نسلوں میں کمزوری پیدا ہو گئی اور نیکی کا تسلسل جاتا رہا۔ اب ہمارے لئے موقع ہے کہ ہم اس کام کو سرانجام دینے کے کوشش کریں تاکہ قومی طور پر اسلام دنیا میں اس طرح قائم ہو جائے کہ پھر اس کے گرنے کا امکان ہی نہ رہے۔ یہ کام ایسا ہے جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ انفرادی رنگ میں بے شک بہت کوششیں ہوئیں مگر قومی طور پر اسلام کی برتری کی ایسی کوشش نہیں کی گئی کہ نیکی کا تسلسل قائم رہتا اور اسلام کے گرنے کا کبھی خطرہ پیدا نہ ہوتا۔ پس کَلَّا لَمَّا یَقْضِ مَآ اَمَرَہٗ میں اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب تک انسان نے وہ بات نہیں کی جس کا ہم نے اسے حکم دیا تھا۔“

(تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ 181 - 182 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

”اللہ تعالیٰ اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کی یہ خوبی بیان فرماتا ہے کہ ان کے دلوں میں بنی نوع انسان کی اتنی گہری محبت ہے کہ انہیں جو کچھ بھی ملے اس کا ایک حصہ وہ دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے ضرور صرف کرتے ہیں۔ وہ صرف روپیہ دے کر یہ

نہیں سمجھ لیتے کہ انہوں نے خدمت کا حق ادا کردیا ہے بلکہ وہ خداتعالیٰ کی عطا کردہ ہر چیز میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں اور اس طرح ان کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر چیز کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو کسی غریب کو چند پیسے دے کر سمجھ لیتے ہیں کہ اس پر عمل ہو گیا وہ غلطی کرتے ہیں۔ جو شخص پیسے تو خرچ کرتا ہے مگر زبان سے تبلیغ نہیں کرتا وہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس حکم پر پوری طرح عمل کر لیا ہے یا جو تبلیغ بھی کرتا ہے مگر بیواؤں اور یتیموں کی خدمت نہیں کرتا وہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس حکم پر پوری طرح عمل کرلیا ہے......اسی طرح اپنے جذبات کو بھی خداتعالیٰ کی راہ میں قربان کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کسی پر غصہ چڑھا تو معاف کردیا۔ اس حکم میں خدمت خلق سے تعلق رکھنے والے مختلف قسم کے کام بھی شامل ہیں جن کی طرف ہماری جماعت کے نوجوانوں کو خصوصیت سے توجہ کرنی چاہئے اور مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر تمام بنی نوع انسان کی احمدی معیار کے مطابق خدمت کرنی چاہیئے تا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔

تیسری خوبی اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی کہ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۡ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۡ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ﴿۵۶﴾ جب وہ خدائے واحد کا انکار کرنے والوں سے کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرلیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ تم ہماری دشمنی کیوں کرتے ہو۔ہمارے اعمال کا بدلہ ہم کو ملے گا اور تمہارے اعمال کا بدلہ تم کو ملے گا۔ ہم تو تمہارے خیر خواہ ہی ہیں لیکن ہم کسی جاہل مطلق غصیلے کی صحبت پسند نہیں کرتے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے لوگوں کی یہ خوبی بیان فرمائی ہے کہ وہ لغو سے اعراض کرتے ہیں۔ مگر افسوس کہ آج مسلمان

بھی جن کی کتاب قرآن ہے اوریورپین امریکن نو مسلم بھی جن کااس آیت میں ذکر ہے سینما اور تھیٹروں کی طرف جاتے ہیں اورلغوسے اعراض کرنے کی بجائے لغوسے محبت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ رسول کریمؐ نے مردوعورت کے اختلاط کو ممنوع قرار دیا ہے اور تھیٹر سارے کے سارے مردوعورت کے اختلاط کاہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ اختلاط نہ کریں اوراگر وہ مل کر ناچیں نہیں تو فلم بن ہی نہیں سکتی۔فلم اسی طرح بنتی ہے کہ مرد بھی ناچتے ہیں اور عورتیں بھی ناچتی ہیں اور فلم تیار ہو جاتی ہے اوریہ چیز اسلامی نقطۂ نگاہ سے ناجائز ہے۔ مگر آج کامسلمان بھی اس لغو پر جان دے رہاہے اور آج کا یورپین اور امریکن نومسلم بھی اس لغو میں ملوّث ہے۔ کاش وہ نصیحت حاصل کریں اور اپنے اندریہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں۔‘‘

(تفسیر کبیر جلد ہفتم صفحہ 524 - 525 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

مولانا مودودی صاحب کے خیال کے مطابق آج کی دنیا میں مسلمان جب تک تلوار نہیں اٹھاتا تب تک اسلام کی تحریک دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔۔۔ کیا تحریک اسلام کو دنیا میں پھیلانے کے لئے کسی تلوار کی ضرورت ہے؟ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ فرماتے ہیں۔

’’الٰہی کلام کی مدد سے لوگوں کو دین کی طرف بلاؤ۔ جو دلائل خود قرآن کریم نے دیئے ہیں انہی کو پیش کرو۔اپنے پاس سے ڈھکونسلے نہ پیش کیا کرو۔ آہ! اگر اس گُر کو مسلمان سمجھتے تو یہودیت اور عیسائیت کو کھا جاتے۔ ہمارا ہتھیار قرآن کریم ہی ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَاهِدْهُمْ بِهِ (فرقان:53) اس قرآن کی تلوار لے کر دنیاسے جہاد کے لئے نکل کھڑا ہو۔ پر افسوس کہ آج دنیا کی ہر چیز مسلمان کے ہاتھ میں ہے لیکن اگر نہیں

تو یہی تلوار، جس کو لے کر نکل کھڑے ہونے کا حکم تھا۔"

(تفسیر کبیر جلد چہارم صفحہ273 پرنٹ ویل امر تسر 2010ء)

قرأت کا منہج / رجحان

بعض مفسرین کا رجحان قرآنی آیات کی مختلف قرأت کو بیان کر کے ان کے معانی اخذ کرنے کی طرف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبید الرحمٰن محسن اور ڈاکٹر حافظ محمد حماد اپنے ایک مشترکہ تحقیقی مقالہ میں جو کہ القلم جون 2017 ء کے ایک شمارہ میں چھپا، لکھتے ہیں۔

"قرأت پر مستقل تفسیر تو معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ تفسیر مظہری اور بیان القرآن میں بالخصوص قرأت سے خاطر خواہ استفادہ کیا گیا ہے اور متفرق قرأت بیان بھی کی گئی ہیں۔ قرأت چونکہ دینی مدارس میں مستقلاً پڑھائی جاتی ہیں اور ان کے الگ شعبے قائم ہیں، اس لئے قرأت کی حجیت اور وضاحت کے متعلق جو کتب تصنیف کی گئیں یا جو مضامین تحریر کئے گئے ہیں ان میں جابجا قرآنی آیات مبارکہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ایسی کتب و مضامین کو ہم قرأت کے رجحان کا حامل تفسیری ادب شمار کر سکتے ہیں۔"

(برصغیر میں قرآن فہمی کے رجحانات اور اثرات ڈاکٹر عبیدالرحمن محسن ڈاکٹر حافظ محمد حماد القلم جون 2018ء صفحہ 68 - 69)

قرأت کے منہج پر لکھی جانے والی تفسیر / تفاسیر

❁ تفسیر جلالین لامام جلال الدین المحلی (791ھ تا 864ھ) امام جلال الدین السیوطی (849ھ تا 911ھ)

اس تفسیر کے مقدمہ میں امام السیوطی لکھتے ہیں۔

هذا ما اشتدت اليه حاجة الراغبين فى تكملة تفسير القرآن الكريم الذى الفه الامام العلامة المحقق جلال الدين محمد بن احمد المحلى الشافعى رحمة الله و تتميم ما فاته وهو من اول سورة البقرة الى آخر سورة الاسراء بتتمة على نمطه من ذكر ما يفهم به كلام الله تعالى والاعتماد على ارجح الاقوال و اعراب ما يحتاج اليه و تنبيه على القراءات المختلفة المشهورة على وجه لطيف و تعبير وجيز و ترك التطويل بذكر اقوال غير مرضية و اعاريب محلها كتب العربية واسال الله النفع به فى الدنيا و احسن الجزاءِ عليه فى العُقبىٰ بِمَنّه و كَرَمِه۔

(تفسیر جلالین صفحہ 7 شرکۃ القدس للمنشر والتوزیع القاہرہ 2006ء)

بعد از حمد و صلوٰۃ و سلام کے، یہ ایک کتاب ہے کہ امام علامہ، محقق جلال الدین محمد بن احمد محلی الشافعی کی کتاب تفسیر القرآن کا تکملہ ہے جو تفسیر اُن سے باقی رہ گئی تھی، اُس کی تتمیم ہے جس کی شدید ضرورت ہے۔ جو اول سورہ بقرہ سے شروع ہو کر آخر سورہ الاسراء تک ہے اور علامہ محلی کے طرز پر جن خصوصیات کی حامل ہے ان میں ایسی چیزوں کا ذِکر ہے جن سے کلامِ الٰہی سمجھنے میں مدد ملے۔تمام اقوال میں سب سے زیادہ راجح قول پر اعتماد کیا گیا ہے۔ضروری اعراب اور مختلف و مشہور قرأت پر لطیف طریقہ اور مختصر عبارت کے ساتھ تنبیہ کی گئی ہے۔ ناپسندیدہ اقوال اور (غیر ضروری) اعراب کو ذِکر کرکے جن کا اصل محل علوم عربیہ کی کتابیں ہیں، تطویل نہیں کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میری درخواست یہ ہے کہ دنیا میں اِس کتاب سے نفع پہنچائے اور آخرت میں بہترین بدلہ مرحمت فرمائے۔

تفسیر کبیر میں قرأت کے منہج
کے حوالے سے ارشادات

”قرأتوں کا فرق شروع زمانہ سے چلا آیا ہے۔ پوری واقفیت نہ رکھنے والے مسلمان بعض دفعہ ایسی روایتوں سے گھبرا جاتے ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ اگر یہ روائتیں درست ہیں تو پھر ہمارا یہ کہنا درست نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم کامل طور پر محفوظ ہے اور اس میں کسی قسم کی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ مگر ایسا نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا۔ اس لئے کہ شروع زمانہ سے ہی نسخ کے منکر اور حفاظتِ قرآنیہ کے قائل قرأت کے اس فرق کو تسلیم کرتے چلے آئے ہیں مگر باوجود اس فرق کے ان کے نزدیک یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ ایک قرأت دوسری کو منسوخ نہیں کرتی اور دوسرے مضمون میں فرق نہیں ڈالتی۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک قرأت ایسا مضمون بیان کرے جس کی دوسری قرأت حامل نہ ہو سکے ہاں بعض دفعہ وہ مضمون کو وسیع کر دیتی اور اس کی مصدق ہوتی ہے۔ در اصل بعض زبانوں کے فرق کی وجہ سے یا بعض مضامین کو نمایاں کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو سبعۃ احرف پر نازل کیا ہے یعنی اس کی سات قرأتیں ہیں۔ ان قرأتوں کی وجہ سے یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے کہ قرآنِ کریم میں کوئی اختلاف ہے بلکہ اسے زبانوں کے فرق کا ایک طبعی نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ بسا اوقات ایک ہی لفظ ہوتا ہے مگر ایک ہی ملک کے ایک حصہ کے لوگ اسے ایک طرح بولتے ہیں اور اسی ملک کے دوسرے حصہ کے لوگ اسے اور طرح بولتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ لفظ بدل گیا ہے یا اس لفظ کا مفہوم تبدیل ہو گیا ہے۔ لفظ بتغیر قلیل وہی رہے گا اس لفظ کے معنے بھی وہی رہیں گے صرف اس وجہ سے کہ کوئی قوم اس لفظ کو صحیح رنگ میں ادا نہیں کر سکتی وہ اپنی

زبان میں ادا کرنے کے لئے اس کی کوئی اور شکل بنا لے گی۔ رسول کریمؐ کے زمانہ میں چونکہ عرب کی آبادی کم تھی قبائل ایک دوسرے سے دور دور رہتے تھے اس لئے ان کے لہجوں اور تلفظ میں بہت فرق ہوتا تھا۔ زبان ایک ہی تھی مگر بعض الفاظ کا تلفظ مختلف ہوتا تھا اور بعض دفعہ ایک معنی کے لئے ایک قبیلہ میں ایک لفظ بولا جاتا تھا دوسرے قبیلہ میں دوسرا لفظ بولا جاتا تھا ان حالات رسول کریمؐ کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دے دی کہ فلاں فلاں الفاظ جو مختلف قبائل کے لوگوں کی زبان پر نہیں چڑھتے۔ ان کی جگہ فلاں فلاں الفاظ وہ استعمال کر لیا کریں۔ چنانچہ جب تک عرب ایک قوم کی صورت اختیار نہیں کر گیا اس وقت تک یہی طریق ان میں رائج رہا۔ اگر اس کی اجازت نہ دی جاتی تو قرآن کریم کا یاد کرنا اور پڑھنا مکہ کے باشندوں کے سوا دوسرے لوگوں کے لئے مشکل ہوتا اور قرآن کریم اس سرعت سے نہ پھیلتا جس طرح کہ وہ پھیلا۔ قبائل کی زبان کا یہ فرق غیر تعلیم یافتہ لوگوں میں اب تک بھی ہے تعلیم یافتہ لوگ تو کتابوں سے ایک ہی زبان سیکھتے ہیں لیکن غیر تعلیم یافتہ لوگ چونکہ آپس میں بول کر زبان سیکھتے ہیں ان میں بجائے ملکی زبان کے قبائلی زبان کا رواج زیادہ ہوتا ہے۔

میں جب حج کے لئے گیا تو ایک یمنی لڑکا جو سولہ سترہ سال کا تھا اور جو سیٹھ ابو بکر صاحب کا ملازم تھا قافلہ کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ میں راستہ میں عربی زبان میں اس سے گفتگو کرتا رہا اور میں نے دیکھا کہ وہ میری اکثر باتوں کو سمجھ جاتا اور ان کا جواب بھی دیتا مگر بعض دفعہ حیرت سے میرے منہ کو دیکھنے لگ جاتا اور کہتا کہ میں آپ کی بات کو سمجھا نہیں۔ میں حیران ہوا کہ یہ بات کیا ہے کہ یہ لڑکا عربی سمجھتا بھی ہے مگر کبھی کبھی رک بھی جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آپ کی بات کو نہیں سمجھا۔ جب میں مکہ پہنچا تو میں نے

کسی سے ذکر کیا کہ یہ لڑکا عرب ہے اور عربی کو خوب سمجھتا ہے مگر باتیں کرتے کرتے بعض جگہ رک جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میری سمجھ میں بات نہیں آئی معلوم نہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ تو ان صاحب نے بتایا کہ یہ لڑکا یمنی ہے اور یمنیوں اور حجازیوں کے بعض الفاظ میں بڑا بھاری فرق ہوتا ہے اس لئے یہ اسی اختلاف کے موقعہ پر ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھتے چنانچہ انہوں نے اس فرق کے بارہ میں یہ لطیفہ سنایا کہ مکہ میں ایک امیر عورت تھی اس کا ایک یمنی ملازم تھا وہ عورت حقہ پینے کی عادی تھی وہاں عام رواج یہ ہے کہ حقہ کے نیچے کا پانی کا برتن شیشے کا ہوتا ہے اس لئے اسے کہتے بھی شیشہ ہی ہیں۔ ایک دن اس عورت نے اپنے ملازم کو بلایا اور اس سے کہا غَیِّرِالشِّیْشَۃَ شیشہ بدل دو۔ لفظ تو اس نے یہ کہے کہ شیشہ بدل دو مگر محاورہ کے مطابق اس کے یہ معنے ہیں کہ اس کا پانی گرا کر نیا پانی بدل کر ڈال دو۔ ملازم نے یہ فقرہ سنا تو اس کے جواب میں کہا سَتِّیِ ھٰذَا طَیِّبٌ بیگم صاحبہ! یہ تو بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ عورت نے پھر کہا کہ قُلْتُ لَکَ غَیِّرِالشِّیْشَۃَ میں نے جو تم کو کہا ہے کہ بدل دو تم انکار کیوں کرتے ہو۔ نوکر نے پھر حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ سَتِیِ ھٰذَا طَیِّبٌ۔ میری آقا! یہ تو اچھا بھلا ہے۔ آخر آخر آقا نے ڈانٹ کر کہا تم میرے نوکر ہو یا حاکم ہو میں جو تم سے کہہ رہی ہوں کہ اسے بدل دو تم میری بات کیوں نہیں مانتے۔ نوکر نے شیشہ اٹھایا اورباہر جا کر اس زور سے زمین پر مارا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ عورت نے کہا ارے! یہ تم نے کیا غضب کیا۔ اتنا قیمتی برتن تم نے توڑ کر رکھ دیا۔ نوکر نے کہا میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ برتن بڑا اچھا ہے مگر آپ مانتی نہیں تھیں۔ اب جو میں نے توڑ دیا ہے تو آپ ناراض ہو رہی ہیں۔ عورت نوکر پر سخت خفا ہوئی مگر ایک یمنی زبان کے واقف نے اسے سمجھایا کہ نوکر کا قصور نہیں کیونکہ حجاز میں غَیِّرْ کے معنے بدلنے کے ہیں اور محاورہ میں جب شیشہ کے ساتھ بولا جائے تو

اس کا پانی بدلنے کے ہو جاتے ہیں۔ یمنی زبان میں تَغۡیِیۡر کے معنے توڑنے کے ہوتے ہیں پس جب تم نے غَیِّرِالشِّیۡشَةَ کہا تو نوکر اپنی زبان کے مطابق یہ سمجھا کہ تم اسے برتن توڑنے کا حکم دے رہی ہو اسی لئے وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ بی بی! یہ تو اچھا بھلا ہے اسے کیوں تڑوا رہی ہو۔ مگر جب تم نہ مانیں اور بار بار زور دیا تو وہ غریب کیا کرتا۔ اب دیکھو غَیِّرِالشِّیۡشَةَ ایک معمولی فقرہ ہے مگر زبان کے فرق کی وجہ سے یمنی نوکر نے اس کے کچھ کے کچھ معنے سمجھ لئے۔ اس قسم کے الفاظ جو زبان کے اختلاف کی وجہ سے معانی میں بھی فرق پیدا کر دیتے ہیں اگر قرآن کریم میں اپنی اصل صورت میں ہی پڑھے جاتے تو یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ ان قبائل کو سخت مشکلات پیش آتیں اور ان کے لئے قرآن کریم کا سمجھنا مشکل ہو جاتا۔ اس نقص کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالی نے ایسے ہم معنی الفاظ پڑھنے کی اجازت دی جن سے قرآن کریم کے سمجھنے اور اس کے صحیح تلفظ کے ادا کرنے میں مختلف قبائلِ عرب کو دقت پیش نہ آئے۔ پس مضمون تو وہی رہا صرف بعض الفاظ یا بعض محاورات جو ایک قوم میں استعمال ہوتے ہیں اور دوسری قوم میں نہیں اللہ تعالی نے ان الفاظ یا ان محاورات کی جگہ ان کی زبان کے الفاظ یا اپنی زبان کے محاورات انہیں بتا دیئے تا کہ قرآن کریم کے مضامین کی حفاظت ہو سکے اور زبان کے فرق کی وجہ سے اس کی کسی بات کو سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل نہ ہوجائے۔ اسی طرح اس کا پڑھنا اور یاد کرنا بھی مشکل نہ رہے ورنہ اصل قرأت قرآن کریم کی وہی ہے جو حجازی زبان کے مطابق ہے اس تفصیل کو معلوم کر کے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک عارضی اجازت تھی اصل کلام وہی تھا جو ابتداً رسول کریمؐ پر نازل ہوا۔ ان الفاظ کے قائمقام اسی وقت تک استعمال ہو سکتے تھے جب تک قبائل آپس میں متحد نہ ہو جاتے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب بجائے اس کے کہ مکہ والے مکہ میں رہتے۔ مدینہ والے مدینہ میں رہتے۔ نجد والے نجد میں

رہتے۔ طائف والے طائف میں رہتے۔ یمن والے یمن میں رہتے اور وہ ایک دوسرے کی زبان اور محاورات سے ناواقف ہوتے۔ مدینہ دارالحکومت بن گیا تو تمام قومیں ایک ہو گئیں کیونکہ اس وقت مدینہ والے حاکم تھے جن میں ایک بڑا طبقہ مہاجرین مکہ کا تھا اور خود اہل مدینہ بھی اہل مکہ کی صحبت میں حجازی عربی سیکھ چکے تھے پس چونکہ قانون کا نفاذ ان کی طرف سے ہوتا ہے، مال ان کے قبضہ میں تھا اور دنیا کی نگاہیں انہی کی طرف اٹھتی تھیں۔ اس وقت طائف کے بھی اور نجد کے بھی اور مکہ کے بھی اور یمن کے بھی اور دوسرے علاقوں کے بھی اکثر لوگ مدینہ میں آتے جاتے تھے اور مدینہ کے مہاجرو انصار سے ملتے اور دین سیکھتے تھے اور اسی طرح سب ملک کی علمی زبان ایک ہوتی جاتی تھی۔ پھر کچھ ان لوگوں میں سے مدینہ میں ہی آ کر بس گئے تھے ان کی زبان تو گویا بالکل ہی حجازی ہو گئی تھی۔ یہ لوگ جب اپنے وطنوں کو جاتے ہوں گے تو چونکہ یہ علماء اور استاد ہوتے تھے یقینا ان کے علاقہ پر ان کے جانے کی وجہ سے بھی ضرور اثر پڑتا تھا۔ علاوہ ازیں جنگوں کی وجہ سے عرب کے مختلف قبائل کو اکٹھا رہنے کا موقع ملتا تھا اور افسر چونکہ اکابر صحابہؓ ہوتے تھے ان کی صحبت اور ان کی نقل کی طبعی خواہش بھی زبان میں یک رنگی پیدا کرتی تھی۔ پس گو ابتداء میں تو لوگوں کو قرآن کریم کی زبان سمجھنے میں دقتیں پیش آتی ہوں گی مگر مدینہ کے دارالحکومت بننے کے بعد جب تمام عرب کا مرکز مدینہ منورہ بن گیا اور قبائل اور اقوام نے بار بار وہاں آنا شروع کر دیا تو پھر اس اختلاف کا کوئی امکان نہ رہا۔ کیونکہ اس وقت تمام علمی مذاق کے لوگ قرآنی زبان سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب لوگ اچھی طرح واقف ہو گئے تو حضرت عثمانؓ نے حکم دیا کہ آئندہ صرف حجازی قرأت پڑھی جائے اور کوئی قرأت پڑھنے کی اجازت نہیں۔ آپ کے اس حکم کا مطلب یہی تھا کہ اب لوگ حجازی زبان کو عام طور پر جاننے لگ گئے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ

انہیں حجازی عربی کے الفاظ کا بدل استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ حضرت عثمانؓ کے اس حکم کی وجہ سے ہی شیعہ لوگ جو سنّیوں کے مخالف ہیں کہا کرتے ہیں کہ موجودہ قرآن بیاضِ عثمانی ہے حالانکہ یہ اعتراض بالکل غلط ہے حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک عربوں کے میل جول پر ایک لمبا عرصہ گذر چکا تھا اور وہ آپس کے میل جول کی وجہ سے ایک دوسرے کی زبانوں کے فرق سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ اس وقت اس بات کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ اور قرأتوں میں بھی لوگوں کو قرآن کریم پڑھنے کی اجازت دی جاتی۔ یہ اجازت محض وقتی طور پر تھی اور اس ضرورت کے ماتحت تھی کہ ابتدائی زمانہ تھا قومیں متفرق تھیں اور زبان کے معمولی معمولی فرق کی وجہ سے الفاظ کے معنے بھی تبدیل ہو جاتے تھے اس نقص کی وجہ سے عارضی طور پر بعض الفاظ کو جو ان قبائل میں رائج تھے اصل وحی کے بدل کے طور پر خداتعالیٰ کی وحی کے مطابق پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی تا کہ قرآن کریم کے احکام کے سمجھنے اور اس کی تعلیم سے روشناس ہونے میں کسی قسم کی روک حائل نہ ہو اور ہر زبان والا اپنی زبان کے محاورات میں اس کے احکام کو سمجھ سکے اور اپنے لہجہ کے مطابق پڑھ سکے۔ جب بیس سال کا عرصہ اس اجازت پر گذر گیا، زمانہ ایک نئی شکل اختیار کر گیا، قومیں ایک نیا رنگ اختیار کر گئیں، وہ عرب جو متفرق قبائل پر مشتمل تھا ایک زبردست قوم بلکہ ایک زبردست حکومت بن گیا، آئینِ ملک کا نفاذ اور نظامِ تعلیم کا اجراء ان کے ہاتھ میں آ گیا، مناصب کی تقسیم ان کے اختیار میں آ گئی، حدود اور قصاص کے احکام کا اجراء انہوں نے شروع کر دیا تو اس کے بعد اصلی قرآنی زبان کے سمجھنے میں لوگوں کو کوئی دقت نہ رہی اور جب یہ حالت پیدا ہو گئی تو حضرت عثمانؓ نے بھی اس عارضی اجازت کو جو محض وقتی حالات کے ماتحت دی گئی تھی منسوخ کر دیا اور یہی اللہ تعالیٰ کا منشاء تھا مگر شیعہ لوگ حضرت عثمانؓ کا سب سے بڑا قصور اگر قرار دیتے ہیں تو یہی کہ

انہوں نے مختلف قرأتوں کو مٹا کر ایک قرأت جاری کر دی۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتے تو آسانی سے سمجھ سکتے تھے کہ خداتعالیٰ نے مختلف قرأتوں میں قرآن کریم پڑھنے کی اجازت اسلام کے دوسرے دور میں دی ہے ابتدائی دور میں نہیں دی جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ قرآن کریم کا نزول گو حجازی زبان میں ہوا ہے مگر قرأتوں میں فرق دوسرے قبائل کے اسلام لانے پر ہوا۔ چونکہ بعض دفعہ ایک قبیلہ اپنی زبان کے لحاظ سے دوسرے قبیلہ سے کچھ فرق رکھتا تھا اور یا تو وہ تلفظ صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتا تھا یا ان الفاظ کا معنوں کے لحاظ سے فرق ہو جاتا تھا اس لئے رسول کریمؐ نے اللہ تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت بعض اختلافی الفاظ کے لہجہ کے بدلنے یا اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھنے کی اجازت دے دی۔ مگر اس کا آیات کے معانی یا ان کے مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا بلکہ اگر یہ اجازت نہ دی جاتی تو فرق پڑتا۔ چنانچہ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ رسول کریمؐ نے ایک سورۃ عبداللہ بن مسعودؓ کو اور طرح پڑھائی اور حضرت عمرؓ کو اور طرح پڑھائی کیونکہ حضرت عمرؓ خالص شہری تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ گڈریا تھے اور اس وجہ سے بدوی لوگوں سے ان کا تعلق زیادہ تھا۔ پس دونوں زبانوں میں بہت فرق تھا۔ ایک دن عبداللہ بن مسعودؓ قرآن کریم کی وہی سورۃ پڑھ رہے تھے کہ حضرت عمرؓ پاس سے گذرے اور انہوں نے عبداللہ بن مسعودؓ کو کسی قدر فرق سے اس سورۃ کی تلاوت کرتے سنا۔ انہیں بڑا تعجب آیا کہ یہ کیا بات ہے کہ الفاظ کچھ اور ہیں اور یہ کچھ اور طرح پڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے گلے میں پٹکا ڈالا اور کہا چلو! رسول کریمؐ کے پاس میں ابھی تمہارا معاملہ پیش کرتا ہوں تم سورۃ کے بعض الفاظ اور طرح پڑھ رہے ہو اور اصل سورۃ اور طرح ہے۔ غرض وہ انہیں رسول کریمؐ کے پاس لائے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! آپ نے یہ سورۃ مجھے اور طرح پڑھائی تھی اور عبداللہ بن مسعودؓ اور طرح پڑھ رہے تھے رسول

کریمؐ نے عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا تم یہ سورۃ کس طرح پڑھ رہے تھے؟ وہ ڈرے اور کانپنے لگ گئے کہ کہیں مجھ سے غلطی نہ ہو گئی ہو مگر رسول کریمؐ نے فرمایا ڈرو نہیں پڑھو۔ انہوں نے پڑھ کر سنائی تو رسول کریمؐ نے فرمایا بالکل ٹھیک ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہؐ ! آپ نے تو مجھے اور طرح پڑھائی تھی۔ آپؐ نے فرمایا وہ بھی ٹھیک ہے پھر آپؐ نے فرمایا قرآن کریم سات قرأتوں میں نازل کیا گیا ہے تم ان معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑا نہ کرو۔ اس فرق کی وجہ در اصل یہی تھی کہ رسول کریمؐ نے سمجھا عبداللہ بن مسعودؓ گڈریا ہیں اور ان کا اور لہجہ ہے اس لئے ان کے لہجے کے مطابق جو قرأت تھی وہ انہیں پڑھائی۔ حضرت عمرؓ کے متعلق آپؐ نے سوچا کہ یہ خالص شہری ہیں اس لئے انہیں اصل مّکی زبان کی نازل شدہ قرأت بتائی۔ چنانچہ آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ان کی اپنی زبان میں سورۃ پڑھنے کی اجازت دے دی اور حضرت عمرؓ کو خالص شہری زبان میں وہ سورۃ پڑھا دی۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے فرق ہیں جو مختلف قرأتوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے مگر ان کا نفسِ مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا ہر شخص سمجھتا تھا کہ یہ تمدن اور تعلیم اور زبان کے فرق کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔

میں ایک دفعہ کراچی میں تھا کہ وہاں ایک ایجنٹ ایک کروڑ پتی تاجر کو مجھ سے ملانے کے لئے لایا۔ ایجنٹ شہری تھا اور تاجر گنواری علاقہ کا۔ جب وہ تاجر مجھ سے بات کرنے لگا تو مجھے مخاطب کر کے کہتا کہ ”تم نوں“ یہ بات معلوم ہو گی۔ اب اول تو تم کا لفظ شہریوں میں معزز آدمی کو خطاب کرتے ہوئے استعمال نہیں کرتے دوسرے تم کے ساتھ ’نوں‘ لگانا تو اور بھی معیوب ہے۔ اردو میں کہیں گے تم کو نہ کہ تم نوں۔ جب وہ تاجر مجھے تم نوں کہتا تو میں نے دیکھا اسے ساتھ لانے والا ایجنٹ بے حد اضطراب کے ساتھ اپنی

کرسی پر پہلو بدلنے لگ جاتا اور میری طرف دیکھتا کہ ان پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا ہے اور مجھے تاجر کے تم نوں اور ایجنٹ کی گھبراہٹ پر لطف آرہا تھا۔ اب معنوں کے لحاظ سے ”آپ کو“ اور ”تم نوں“ میں کوئی بھی فرق نہیں لیکن ایک شہری کے لئے ”تم نوں“ کہنا اور ایک انبالہ پٹیالہ کے گنوار کے لئے ”آپ کو“ کہنا ایک مجاہدہ سے کم نہیں۔ پنجاب میں گجرات کی طرف کے لوگ پکڑنے کو ”پھدنا“ کہتے ہیں اور ہماری طرف کے لوگ ”پھڑنا“۔ ہم لوگ پھدنا کہیں تو ماتھے پر پسینہ آجاتا ہے گجراتی پھڑنا کہتے ہیں توان کے گلے میں پھندے پڑتے ہیں۔ گورداسپور میں شریر آدمی کو شُہدا کہتے ہیں۔ ضلع سرگودہا میں شریف اور نیک طبیعت کو شُہدا کہتے ہیں۔ ایک دفعہ حضرت خلیفہ اولؓ کی ایک عزیزہ آئی کسی ذکر پر اس نے آپ کی نسبت کہا ”اوساں شہدے نوں انہاں گلاں دا کہہ پتا“ یعنی مولوی صاحب! شریف آدمی ہیں ان کو ایسی باتوں کا کیا علم۔ اس طرف کی مستورات نے ایک دفعہ اس فقرہ کو سنا اور حیاء کے ماتحت برداشت کر گئیں مگر اتفاق سے اس نے پھر دہرایا تو وہ اس سے دست و گریباں ہونے کو تیار ہو گئیں اور کہا کہ کچھ حیاء کرو تم تو گالیاں دے رہی ہو۔ اس غریب نے حیرت سے پوچھا کہ میں تعریف کر رہی ہوں کہ گالیاں دیتی ہوں۔ ”اوہ شُہدا تے ہے۔“ آخر کسی عورت نے جو اس فرق کو سمجھتی تھی اس جوش کو ٹھنڈا کیا۔ اب دیکھو کسی کتاب میں جو سارے پنجاب کے لئے لکھی گئی ہو کسی بزرگ کی نسبت شُہدے کا لفظ آجائے تو اس کی توضیح یا دوسرے علاقہ کے لئے دوسرے لفظ کا استعمال مقرر کرنا ضروری ہو گا یا نہیں؟ یہی ضرورت اس زمانہ میں مختلف قرأتوں کی اجازت کی تھی لیکن جب تمدن اور حکومت کے ذریعہ سے قبائلی حالت کی جگہ ایک قومیت اور ایک زبان نے لے لی اور سب لوگ حجازی زبان سے پوری طرح آشنا ہو گئے تو حضرت عثمانؓ نے سمجھا اور صحیح سمجھا کہ اب ان قرأتوں کو قائم رکھنا اختلاف کو

قائم رکھنے کا موجب ہو گا اس لئے ان قرأتوں کا عام استعمال اب بند کرنا چاہئے باقی کتب قرأت میں تو وہ محفوظ رہیں گی۔ پس انہوں نے اس نیک خیال کے ماتحت عام استعمال میں حجازی اور اصل قرأت کے سوا باقی قرأتوں سے منع فرما دیا اور عربوں اور عجمیوں کو ایک ہی قرأت پر جمع کرنے کے لئے تلاوت کے لئے ایسے نسخوں کی اجازت دے دی جو حجازی اور ابتدائی قرأت کے مطابق تھے۔

ابن اُم عبد کا یہ واقعہ بھی اسی قسم کے قرأت کے اختلاف کے متعلق ہے۔ عربی زبان میں مَا کا استعمال کئی معنوں میں ہوتا ہے مانافیہ بھی ہے اور مصدریہ بھی اور مَامَنْ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ جب مصدریہ معنے اور مَنْ کے معنے دونوں ہی مراد ہوں تو ایسے مقام پر مَنْ کا استعمال کرنا یا مصدر کا استعمال کرنا مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ مصدر ایک معنے دے گا اور مَنْ دوسرے معنے دے گا دونوں معنے کسی ایک طریق کے استعمال سے ظاہر نہ ہوں گے مگر چونکہ ایسے کئی مواقع قرآن کریم میں آتے ہیں جب کہ مصدری معنے اور مَنْ کے معنے دونوں ہی بتانے مقصود ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں ایسے مواقع پر مَا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تا یہ دونوں مفہوم ظاہر ہوں۔ مگر بعض عرب قبائل مَا کے مصدری معنے تو کرتے ہیں لیکن مَا کا استعمال مَنْ کی جگہ ناجائز سمجھتے ہیں اس لئے اس استعمال سے ان کے لئے مشکل پیش آجاتی تھی پس اس کو دور کرنے کے لئے وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى کی قرأت کی بھی اجازت دے دی گئی۔ جو جملہ ایک حد تک مَا کا مفہوم ادا کر دیتا ہے لیکن چونکہ ویسا مکمل مفہوم ادا نہیں کرتا جیسے مَا اس لئے اصل قرآنی عبارت کے طور پر اسے استعمال نہیں کیا گیا صرف عارضی قرأت کے طور پر اس کا استعمال جائز رکھا گیا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابوالدرداء کو کوئی غلطی لگی ہو جب وہ خود کہتے ہیں کہ صحابہؓ مجھ پر زور دیتے ہیں کہ میں وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی پڑھوں۔ تو اس کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اس بارہ میں ضرور کوئی بھول چوک واقعہ ہو گئی ہے ورنہ صحابہؓ کی اکثریت ان پر یہ زور نہ ڈالتی کہ اصل قرأت وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ہی ہے وَالذَّكَرِ وَالْاُنْثٰی نہیں ہے پس اول تو ضروری نہیں کہ ہم اس کو دوسری قرأت قرار دیں جب کثرت سے صحابہؓ کہتے ہیں کہ یہ قرأت نہیں تو ضروری ہے کہ ہم اسے قرأت قرار نہ دیں بلکہ ابوالدرداء کی رائے کو غلط سمجھیں۔ لیکن اگر اس قرأت کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس سے آیت کے معنوں میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اور قرأت کا اختلاف قرآن کریم کے کسی نقص پر نہیں بلکہ اس کے معنوں کی وسعت پر دلالت کرتا ہے۔

قریب کے زمانہ میں ایک انگریز نے قرآن کریم کے تین پرانے نسخے نکالے ہیں وہ حلب میں ایک مسیحی مونسٹری MONESTRY میں پروفیسر مقرر رتھا۔ اس نے اپنے زعم میں قرآن کریم کے تین پرانے نسخے حاصل کئے ہیں اور ان کے باہمی اختلافات کو اس نے LEAVES FROM THREE DIFFERENT QURANS یعنی "قرآن کے پرانے تین نسخوں کے متفرق اوراق" کے نام سے شائع کر دیا۔ جب وہ کتاب شائع ہوئی تو لوگوں میں بڑا شور اٹھا اور عیسائیوں میں یہ سمجھا جانے لگا کہ اب قرآن کریم کی حفاظت کا دعویٰ بالکل باطل ہو گیا ہے۔ میں نے بھی وہ کتاب منگوائی تا کہ میں دیکھوں کہ قرآن کی حفاظت کے خلاف اس میں کون سے دلائل دیئے گئے ہیں۔ جب میں نے اسے پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ جو نسخے اس کے پیش کئے گئے ہیں ان میں اسی قسم کا اختلاف ہے کی کسی جگہ مَا کی جگہ مَنْ ہے اور کسی جگہ مَنْ کی جگہ مَا ہے۔ کسی جگہ قالُوْا کے آگے

الف ہے اور کسی جگہ الف نہیں۔ کسی جگہ ہُ کی بجائے ھُمْ کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس قرآنی نسخہ کا اختلاف یا تو بعض قرأتوں پر مبنی تھا یا کتابت کی غلطیاں تھیں اور بس۔ میں نے اسے پڑھ کر نتیجہ نکالا کہ اگر ان مزعومہ قدیم نسخوں کو درست سمجھا جائے تب بھی اس سے قرآن کریم کے محفوظ ہونے کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ اس کی عبارات معنوں کے لحاظ سے کوئی فرق پیدا نہیں کرتیں۔ صرف کسی جگہ مَا کی جگہ مَنْ اور ہُ کی جگہ ھُمْ کی ضمیر بدلی ہوئی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف قرأتوں کا فرق ہے اور کچھ بھی نہیں۔ غرض عیسائیوں کے کتب خانہ میں سے بھی کوئی کتاب ایسی نہ نکلی جو قرأت کے اس فرق کے علاوہ قرآن کریم کے نسخوں میں کوئی اور فرق ثابت کر سکتی۔ حضرت مسیح موعودؑ نے بھی اسی قرأت کے فرق کو بعض جگہ پیش کیا ہے۔ مثلاً وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ کی تفسیر کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مَوْتِهٖ کی بجائے ایک قرأت مَوْتِهِمْ بھی آتی ہے جو آپ کے بیان کردہ مضمون کی تائید کرتی ہے۔ پس قرأتوں کا اختلاف یا تو قبائلی زبانوں کے فرق کے ضرر سے بچانے کے لئے ہے یا قرآنی معنوں کی وسعت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے۔“

(تفسیر کبیر جلد نہم صفحہ 47 - 52 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

تاریخ میں کچھ مفسرین کا رجحان قرآنی آیات کو فلسفیانہ نظر سے دیکھ کر اس کے علم و معانی کا احاطہ کرنا بھی رہا ہے۔دنیائے اسلام میں جب عہد عباسی میں بالخصوص جب مسلمان علماء نے یونان، فارس اور ہندوستان سے تعلق رکھنے والے اقدم علماء کی فلسفہ کی کتب کو ترجمہ کیا تو اس وقت علوم کی مختلف و متنوع جہات ان کے سامنے کھلیں۔جب مسلم علماء نے ان کتب کا مطالعہ کیا تو ان میں ایک فلسفیانہ سوچ نے پروان چڑھا۔ان فلسفیانہ

نظریات و عقائد کا احاطہ کرنا اور فلاسفہ کے وحی و الہام پر عقل کو فوقیت دینے کے علاوہ کئی اور معاملات میں کہ جن میں دین اور مذہب پر اعتراضات کئے گئے کے رد کے طور پر فلسفیانہ رجحان کی تفاسیر کو لکھا گیا۔ اسی اصل کو حضرت مصلح موعودؓ نے اپنی تفسیر میں ایک جگہ کچھ ایسے بیان فرمایا۔

”اہل فلسفہ کے قرآن مجید پر اعتراضات کے دفیعہ کے لئے مسلمانوں نے فلسفہ وغیرہ علوم کی تجدید کی اور علم منطق کے لئے نئی مگر زیادہ محقق راہ نکلی۔“

(تفسیر کبیر جلد صفحہ پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

(روزنامہ الفضل، آن لائن ایڈیشن، مطبوعہ 11 اکتوبر 2022ء، لندن)

قسط 6
فلسفیانہ منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

اس سلسلہ میں یاد رکھنا چاہیئے کہ فلسفیانہ منہج پر کوئی مستقل تفسیر تو میری ناقص نظر سے نہیں گزری۔ بہر حال فارابی (872ء تا 950ء) کی کتاب فصوص الحکم میں قرآن کریم کی خالص فلسفیانہ طرز پر تفسیر کی گئی ہے۔ ایسے ہی اخوان الصفا (اخوان الصفا و خلان الوفا تیسری صدی کے مسلمان فلاسفروں کی ایک تنظیم تھی، جو بصرہ میں قائم ہوئی۔ اس کا بنیادی کام اسلامی عقائد اور فلسفیانہ حقیقتوں کو ہم آہنگ کرنا تھا۔ اس تنظیم نے مشترکہ طور پر اس علمی کام پر قریباً پچاس مقالہ جات لکھے جو کہ ”تحف اخوان الصفا“ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ حکیم مجریطی قرطبی نے اسی طرز پر ایک کتاب لکھی اور اس کا نام رسائل اخوان الصفا رکھا۔) کے رسائل میں قرآنی تعبیرات فلسفہ کی مدد سے کی گئیں۔ ایسا ہی ابن سینا نے قرآنی آیات کی تفسیر اسی منہج پر اپنے رسائل میں کی ہے۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل تفاسیر کو شیعہ از قبیل فلسفیانہ تفاسیر گنتے ہیں۔

- تفسیر القرآن الکریم لصدرالمتالهین شیرازی (شیعہ) (979ء تا 1050ء)
- مخزن العرفان از نصرت امین اصفہانی (شیعہ) (المتوفیٰ 1403ء)
- تفسیر کبیر از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ میں فلسفہ اور دینی روحانی تعلیم کے مابین فرق کے حوالہ سے ارشاد۔

”روحانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایسے کلام کی ضرورت ہے جو صرف ایک وقت

کے لوگوں یا چند لوگوں کے فائدہ کے لئے نہ ہو۔ بلکہ مختلف فطرتوں اور مختلف زمانوں کی ضرورت کو پورا کرنے والا ہو اور جس کے ذریعہ سے دنیا روحانی مسافت طے کرسکے۔ یعنی ایک نبی کے زمانہ سے اس کے بعد کے نبی کے زمانہ تک پہنچانے کی اس میں قابلیت ہو۔ یعنی اس میں ایسا ارتقاء ہو کہ فطرت انسانی اس پر چل کر اگلے روحانی ملک میں یعنی بعد میں آنے والے نبی کی تعلیم تک پہنچنے کی قابلیت پیدا کرلے۔ انسان کو کیا معلوم ہے کہ سو یا دوسو سال بعد انسانی دماغ نے کیا ترقی کرنی ہے کہ وہ اس کے مطابق ذہنوں کو روشنی پہنچانے کے سامان کرلے۔ یہ سفر تو الٰہی بنائے ہوئے راستہ پر ہی طے ہوسکتاہے۔ جو انسانی دماغ کو برابر ترقی دیئے چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف فلسفے ایک شاہراہ پر گامزن نہیں ہوتے۔ بلکہ کبھی آگے قدم بڑھاتے ہیں اور کبھی پھر واپس صدیوں کے فلسفہ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی تعلیمات نبیوں کی معرفت انسانوں کو ایک ہی شاہراہ پر آگے ہی آگے بڑھاتی چلی گئی ہیں اوران میں کسی جگہ بھی رجعت قہقری پیدانہیں ہوئی۔“

(تفسیر کبیر جلدچہارم صفحہ147-148 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

سائنسی یا کونّی منہج / رجحان

اس اسلوب پریعنی سائنسی یا علوم جدیدہ کے رجحان کے ساتھ لکھی جانے والی تفاسیر علماء کے نزدیک مبحث رہی ہیں۔ بعض نے ان کی پذیرائی کی اور بعض نے ان پر تنقید کی۔ بعض نے ایسی تفاسیر میں قرآن کریم کو صرف سائنس کی ایک کتاب کے طور پر پیش کیا ہے، جس کی وجہ سے ان پر تنقید کی گئی ہے۔ اس منہج کا ذکر امام السیوطی (المتوفیٰ 911ھ)

نے الاتقان فی علوم القرآن میں پینسٹھویں نوع میں بھی کیا۔

(الاتقان فی علوم القرآن لسیوطی جلد 3 صفحہ 164 مطبوعہ مکتبۃ السنۃ 2019ء)

اسی طرح ڈاکٹر محمد حسین الذہبی نے بھی اپنی کتاب التفسیر والمفسرون میں کونی رجحان کو جدید رجحانات تفسیر میں قرار دیا۔

(التفسیر والمفسرون جلد ثانی صفحہ 417 مطبوعہ دار الحدیث القاہرہ سن 2012ء)

کونی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

- کشف الاسرار النورانیۃ القرآنیۃ لمحمد بن احمد الاسکندرانی (المتوفیٰ 1888ء)
- تفسیر المنار لشیخ محمد بن عبدہ بن حسن (1849ء تا1905ء)
- الجواھر فی تفسیر القرآن الکریم للشیخ طنطاوی جوہری (1880ء تا1939ء)
- تفسیر المراغی لمحمد مصطفیٰ المراغی (1881ء تا 1945ء)

برصغیر میں سائنسی یا کونی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر کے بارہ میں ڈاکٹر عبیدالرحمن محسن اور ڈاکٹر حافظ محمد حماد اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھتے ہیں۔

”جدیدی سائنسی تحقیقات کی روشنی میں قرآن مجید کی تشریحات و تفسیرات اور اس کے حوالے سے اعجاز القرآن کا اثبات بھی ایک اور نمایاں رجحان ہے۔ اگرچہ اس حوالے سے کوئی مستقل تفسیر نظر سے نہیں گزری لیکن اس مناسبت سے کتابیں منظر عام پر آتی رہتی

ہیں۔"

(برصغیر میں قرآن فہمی کے رجحانات اور اثرات ڈاکٹر عبیدالرحمن محسن ڈاکٹر حافظ محمد حماد القلم جون 2018ء صفحہ 71)

الجواھر فی تفسیر القرآن کے بارہ میں معروف محمد رشید رضا (المتوفیٰ:1315ھ) ایک دلچسپ بات لکھتے ہیں۔

"میں نے اس تفسیر (الجواھر فی تفسیر القرآن) کو دیکھا ہے اور اس کے بارہ میں وہی بات کہی جا سکتی ہے جو کہ علماء نے رازی کی تفسیر کے بارہ میں کہی کہ اس میں سب کچھ ہے مگر تفسیر نہیں۔"

(مجموع فتاوی القرآن الکریم من القرن الاوّل الی القرن الرابع عشر از محمد موسیٰ الشریف جلد اوّل صفحہ 413 مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت 2014ء)

تفسیر کبیر میں کونیّ منہج کی چند مثالیں

سائنس کی تمام تر بنیاد توحید پر ہے

"اگر توحید کا عقیدہ نہ اختیار کیا جائے تو قانون قدرت اور قانون شریعت دونوں کی بنیاد ہل جاتی ہے۔ قانون شریعت کا تعلق تو واضح ہی ہے۔ مگر قانون قدرت کی تمام ترقیات اور سائنس کی تمام تر بنیاد بھی توحید پر ہی ہے۔ کیونکہ اگر مختلف خدامانے جائیں توان کے مختلف قانون ہونے چاہئیں۔ یاپھر کم از کم اس میں مختلف تبدیلیاں ہوتی رہنی چاہئیں اور اگر ایسا ہو یعنی ایک اٹل قانون اور ایک قائم سلسلہ قانون قدرت کادنیا میں جاری نہ ہو تو تمام

علمی ترقیات یکدم بند ہوجائیں گی۔ کیونکہ سائنس کی ترقی اور ایجادات کی وسعت کی بنیاد اسی پر ہے کہ دنیا میں ایک منظم اور نہ بدلنے والا قانون جاری رہے۔ اگر انسان کو یہ خیال ہو کہ عالم میں کوئی نظام نہیں۔ یا یہ کہ نظام بدلتا رہتا ہے تو وہ کبھی بھی قانون قدرت کی باریکیوں کے دریافت کرنے کی طرف توجہ نہیں کرسکتا۔‘‘

(تفسیر کبیر جلد چہارم صفحہ 320-321 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

آخری زمانہ میں سائنسی ترقیات کا قرآن میں ذکر

’’قرآن کریم میں بھی سورہ رحمٰن میں ان شمالی لوگوں کو یعنی یورپ کے باشندوں کو جنّ کہا ہے۔ اس سورۃ میں آخری زمانہ کے تغیرات کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس وقت دو مشرق اور دو مغرب ہوجائیں گے یعنی امریکہ کی دریافت سے دو علاقے مشرق اور مغرب کہلانے لگیں گے۔ اسی طرح نہر سوئز کے ذریعہ دوسمندروں کے ملنے اور بڑے بڑے جہازوں کے چلنے کی خبر دی گئی ہے اسی طرح بتایا ہے کہ اس وقت سائنس کی ترقی کے ساتھ لوگ آسمانی بادشاہت کو فتح کرنے کے خیال میں مشغول ہوں گے اور سمجھیں گے کہ وہ جلد کائنات کاراز دریافت کرنے والے ہیں۔ اس وقت آسمان سے آگ گرے گی اور بم گریں گے اور سرخ روشنیاں آسمان پر چھوڑی جائیں گی اور آخر کفر اور شرک کو تباہ کرکے اسلام کو غلبہ دیا جائے گا۔ اس مضمون کے سلسلہ میں جنّ و انس کو بھی مخاطب کیا گیا ہے اور جنّ سے مراد وہی شمالی علاقوں کے لوگ یعنی یورپین مراد ہیں اور بتایا ہے کہ اس زمانہ میں یورپ اور ایشیا کے لوگ باہم مل جائیں گے اور سائنس کی بڑی ترقی ہوگی۔ مگر بے دینی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عذاب نازل کرے گا اور پھر اسلام کو قائم کرے گا۔

ثقلان اور جنّ اور الناس سے مراد ڈیمو کریسی اور ڈکٹیٹروں کی حکومت بھی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ جنّ کے معنے عربی لغت میں اکثریت کے بھی ہیں اور الناس کے معنے خاص آدمیوں کے بھی ہوسکتے ہیں۔ پس جنّ سے مراد ڈیمو کریسی ہے اور الناس سے مراد وہ لوگ ہیں جواپنے آپ کو خاص قرار دے کر حکومت کو اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ ثقل کے معنی اعلیٰ اور محفوظ شے کے ہوتے ہیں۔ جیسے رسول کریمؐ نے قرآن کریم اور اپنی اولاد کو ثقلان قرار دیا ہے۔ پس الثقلان سے مراد یہ دونوں گروہ ہیں جو اس وقت ساری دنیا پر غالب ہوں گے بعض ڈیما کریسی کے نام پر دنیا کو مغلوب کریں گے اور بعض فاشزم اور ناٹزم کے نام پر دنیا کو سمیٹنا چاہیں گے اور اپنے آپ کو سب دنیا سے بہتر قرار دیں گے۔"

(تفسیر کبیر جلدچہارم صفحہ 64 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

اجرام فلکی کی تاثیرات اور قرآنی بیان

"ایک اورقسم کی نعمتوں کا ذکر کیا جو جمادات سے تعلق رکھتی ہیں اوران میں سے بھی انہی کا انتخاب کیاہے جو انسانی دماغ کے نشوونما پر خاص طورپر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بے شک انسان لوہے، لکڑی، سونے، چاندی، پیتل سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے لیکن ان اشیاء سے وہ بڑافائدہ بیرونی آرام کی قسم کا حاصل کرتا ہے، برتن بناتا ہے، مکان بناتا ہے، آلات بناتا ہے، براہ راست ان اشیاء کا اثر انسانی دماغ پر نہیں پڑتا۔ لیکن چونکہ اس جگہ انسانی دماغ کے نشوونما کے ذکر پر زوردینا مقصود ہے۔ اس لئے جمادات کی مذکورہ بالا اقسام کی بجائے رات اوردن سورج،چاند اورستاروں کا ذکر کیا گیا۔

کہا جاسکتا ہے کہ رات اوردن تو جمادات میں سے نہیں اوریہ درست بھی ہے۔ لیکن اس

سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ رات اور د ن کے فوائد سورج اورچاند اورستاروں کے اثرات سے وابستہ ہیں اور وہ اجرام فلکی ان کے ذریعہ سے اپنی تاثیرات ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی اپنی شعاعوں کو نازل کرکے یاان کو روک کر۔ اس لئے رات اوردن بھی درحقیقت جمادی اثرات میں ہی شامل ہونے کے مستحق ہیں۔

اگر کہا جائے کہ رات اور دن جب سورج اور چاند اور ستاروں کے ظہور اور فوائدپر دلالت کرتے ہیں۔ تو پھر سورج چاند وغیرہ کا الگ نام لینے کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گورات اور دن ان اجرام فلکی کی تاثیرات کے ظہور کا نام ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی سورج اور چاند اورستاروں کے اثرات ہیں اور ان سے ایسی تاثیرات بھی دنیا پر پڑتی ہیں جو آنکھوں سے نظر آنے والی شعاعوں کے علاوہ دوسرے ذرائع سے انسان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ جیسے برقی یامقناطیسی اثرات اوران کے سوااور کئی قسم کی تاثیرات ہیں جو سائنس روز بروز دریافت کررہی ہے اور کئی وہ شائد کبھی بھی دریافت نہ کرسکے۔ پس باوجود اس کے کہ رات اور دن اجرام فلکی کے تاثیرات کے ظہور کاذریعہ ہیں۔ ان کے علاوہ بھی سورج اورچاند ستاروں کا نام لینے کی ضرورت تھی۔ تاان دوسری تاثیرات کا ذکر کیا جائے جن سے انسانی دماغ فائدہ اٹھارہا ہے۔

اس جگہ یہ سوال ہو سکتاہے کہ اگر یہ بات ہے۔ توپھر رات اوردن کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ سورج چاند اور ستاروں کاذکر کافی تھا۔ اس کاجواب یہ ہے کہ سورج چاند اورستاروں کی دوسری تاثیرات سے تو عرب لوگ ابھی واقف نہ تھے۔ صرف رات اوردن کی تاثیرات سے ان کو آگاہی تھی اور اب بھی علمی طبقہ کے علاوہ باقی لوگ رات اور دن کی تاثیرات اور ان کے فوائد سے تو آگاہ ہیں۔ لیکن سورج چاند اور ستاروں کی دوسری تاثیرات

سے واقف نہیں ہیں۔ پس فائدہ کو وسیع کرنے کے لئے اورقرآن کریم کے پہلے مخاطبوں کے ذہنوں سے مضمون کو قریب الفہم بنانے کے لئے ضروری تھا کہ دن اوررات کو الگ بھی بیان کر دیا جاتا۔ تا کہ ان کادماغ بسہولت آیت کے مضمون کی طرف منتقل ہوسکتا۔

یاد رہے کہ سائنس کی موجودہ تحقیق نے سپکٹرم کے ذریعہ سے جو ایک ایسا آلہ بنایا ہے جس کے ذریعہ سے روشنی کی شعاعوں کو پھاڑ کر الگ الگ کرلیا جاتا ہے۔ یہ معلومات حاصل کی ہیں کہ فلاں ستارے میں فلاں قسم کی دھاتیں ہیں اورفلاں میں فلاں قسم کی۔ جس سے معلوم ہوتاہے کہ صرف روشنی ہی نہیں بلکہ روشنی کے ساتھ مختلف دھاتوں کی تاثیرات بھی دنیا پر اُترتی رہتی ہیں اور ان سے اہل دنیا کے دماغ اور قویٰ پر مختلف اثرات نازل ہوتے رہتے ہیں۔ چاند کی شعاعوں کی تاثیرات تو کئی رنگ میں دنیا پر ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ عام طور پر ہمارے ملک میں مشہور ہے کہ چاند گرہن جب مکمل ہو۔ توحاملہ عورتوں پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ ایسے وقت میں حاملہ عورتیں کمروں سے باہر نہیں نکلتیں۔ گو عام طور پر اسے وہم سمجھا جاتا ہے۔ مگر میں نے اس سوال پر خاص طورپر غور کیا ہے اور معلوم کیا ہے کہ جب چاند گرہن مکمل ہو۔ تواس کے بعد بہت سی عورتوں کی زچگی سخت تکلیف دہ ہوتی ہے اور ان میں سے بکثرت موتیں ہوتی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تکلیف اٹھانے والی عورتیں وہ ہوتی ہیں۔ جو ایسے وقت میں چاند کو دیکھتی ہیں۔ یا اس کے بغیر بھی ان پر یہ تاثیر عمل کرتی ہے۔ مگر بہرحال میں نے کئی دفعہ اس کا تجربہ کیا ہے اور دوسروں کو بھی بتایا ہے۔ جنہوں نے اپنے تجربہ سے اس کی تصدیق کی ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ تاثیر ہمیشہ ہوتی ہے یااس کاظہور بعض اور ستاروں کی نسبت سے ہوتاہے۔ یعنی چاند دوسرے ستاروں سے ایک خاص زاویہ پرہو۔ تواس وقت اس کی یہ تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔

یا آزادانہ ہوتی ہے۔ یہ منجم ہی بتاسکتے ہیں۔ میں نے تو بعض توہمات کی تحقیق کرتے ہوئے جو چاند گرہن کی حاملہ عورتوں پر تاثیر کے متعلق ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں یہ امور مشاہدہ کئے ہیں۔ ان کو معیّن اور علمی صورت دینا ستاروں کے علماء کا کام ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمادات کی روشنیاں اور شعاعیں اورمقناطیسی تاثیرات بھی انسانی نشوونما پر خاص اثر ڈالتی ہیں جن میں سے بعض ظاہر ہوتے ہیں بعض مخفی اور بعض بلا واسطہ ہوتے ہیں اور بعض بالواسطہ۔ بالواسطہ سے میری مراد ان تاثیرات سے ہے جو نباتات یا حیوانات پروارد ہوتی ہیں اورپھر ان حیوانات اور نباتات کو انسان استعمال کرتاہے۔ سورج اورچاند کی موٹی تاثیرات سے مراد وہ تاثیرات ہیں جوصحت پر پڑتی ہیں۔ دن کی روشنی کئی قسم کی بیماریوں کو دور کرتی ہے اورانسانی جسم میں صحت کا مادہ بڑھاتی ہے۔ چنانچہ جولوگ دن رات بند کمروں میں رہتے ہیں ان کی صحت خراب ہوجاتی ہے۔ اسی طرح رات کی تاریکی اعصاب پر تسکین دہ اثر ڈالتی ہے۔ اسی وجہ سے رات کی نیند بہت آرام دہ ہوتی ہے بہ نسبت دن کی نیند کے۔ خصوصاً دوپہر کی نیند کے۔ کہ اس سے نہ صرف یہ کہ آرام کم ملتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ اس سے نزلہ وغیرہ کی قسم کی بیماریاں بھی پیداہوتی ہیں۔ غرض دن کام کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے اور رات آرام کے لحاظ سے۔ پھر بعض قسم کی سبزیوں پر دن کی روشنی کی مبارک تاثیر پڑتی ہے اور بعض پر رات کی روشنی کی جو چاند اورستاروں سے آتی ہے۔ چنانچہ ککڑی رات کو اس سرعت سے بڑھتی ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ بعض دفعہ کھیت کے پاس بیٹھو تویوں آواز پیداہوتی ہے گویا کہ ککڑی پتوں میں پھیل رہی ہے اسی طرح بعض پھول چاندنی راتوں میں کھلتے ہیں۔ بعض اندھیری راتوں میں اوریہ سب امور اس امر کی شہادت ہیں کہ رات اور دن اور اجرام فلکی کی تاثیرات اہل دنیا کے نشوونما پر خاص

اثر ڈال رہے ہیں اور ان کا وجود صرف آنکھوں کے لئے روشنی مہیا کرنا نہیں۔ یااعصاب کے آرام کے لئے تاریکی دینا ہی نہیں۔ بلکہ ان کے علاوہ بھی ان کی وسیع تاثیرات ہیں۔ جن لوگوں کو چاند کی روشنی میں سیر کرنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے اس کا مشاہدہ کیا ہو گا کہ اس وقت خیالات میں ایک عجیب قسم کا ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اور قوتِ فکریہ میں ایک تلاطم پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح رات اور دن اور سورج اور چاند اور ستاروں کا تعلق راستہ دکھانے سے بھی ہے۔ دن کوسورج کی روشنی اگر سب فضا کو روشن کرکے راستہ دکھانے میں مدہوتی ہے اور جہات اربعہ یعنی مشرق مغرب شمال جنوب کوبتا کر اگر راہگیروں کی راہنمائی کرتی ہے۔ تو رات کو چاند اپنی روشنی سے سورج کاسا کام کرتا ہے اور ستارے اپنے مقامات سے ہدایت کاموجب ہوتے ہیں۔ چنانچہ سمندروں میں جہازوں کے چلنے میں ستاروں کے مقامات خاص طورپر مدد کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رات اوردن اورسورج چاند اورستارے انسانی دماغ کو نشوونما دینے میں اور اس کے کاموں میں سہولت پیدا کرنے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اوریہ جمادات میں سے ہیں جو انسان سے بہت دور کا تعلق رکھتے ہیں اوران کی ذاتی نشوونما کی طاقت ایسی مخفی ہے کہ اس کااندازہ ظاہری نگاہ سے نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن باوجود اس کے وہ اپنی تاثیرات سے نباتات اورحیوانات کے نشوونما پر ان کے ذریعہ سے بھی اوربراہ راست بھی انسان کے نشوونما پر خاص اثر ڈالتے ہیں۔ پس حیوانی غذا اور نباتاتی غذا کے بعد اس مخفی غذا کی طرف اشارہ کیا جو انسان جمادات اور خصوصاً ان بڑے جمادی اجرام سے جو آسمان پر ہیں حاصل کر رہا ہے۔

اس جگہ ایک اور لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حیوانوں اور نباتات کے بارہ میں توصرف یہ فرمایا تھا کہ ہم نے ان کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ لیکن رات اور دن اور

سورج چاند ستاروں کے ذکر میں سَخَّرَ کا لفظ فرمایا ہے۔ جس کے معنی ہیں بغیر اجرت کے کام پر لگار کھا ہے۔ یہ فرق اس لئے کیا کہ حیوانوں اور نباتات سے انسان جو فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کے متعلق وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنے زور سے یہ فائدہ اٹھایاہے۔ گو یہ غلط ہے۔ کیونکہ خداتعالیٰ ان کو پیدانہ کرتا تووہ فائدہ کہاں سے اٹھاتا۔ مگر پھر بھی چونکہ بظاہر اس میں انسانی اختیار کا دخل ہے۔ وہاں صرف پیدائش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مگر اس آیت میں جو فوائد بیان ہوئے ہیں۔ ان کے حصول میں انسانی تصرف کا کوئی دخل نہیں۔ اس لئے اس جگہ سَخَّرَ کالفظ استعمال کرکے بتایا کہ کم سے کم ان اشیاء کی نسبت تو تم کوماننا پڑے گا کہ وہ جو انسانی خدمت کررہی ہیں۔ ان کا موجب حکم الٰہی ہے۔ کیونکہ ان پر تم کو کوئی تصرف حاصل نہیں ہے۔

اس آیت کے آخر میں یہ فرمایا کہ یہ امور عقل مندوں کے لئے نشان ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوت فکر یہ نزدیک کی اشیاء کاحال معلوم کرتی ہے اور قوت عقل دور کی چیزوں سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ چونکہ پہلی آیات کی اشیاء خوراک سے تعلق رکھتی تھیں اور انسان ان کے اثر کو اپنے اندر محسوس کرتاہے۔ اس لئے وہاں فکر کا لفظ رکھا ہے اور ان چیزوں کی تاثیر بیرونی ہے اور ان سے فائدہ اٹھانا دانش سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے لِقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ فرمایا۔“

(تفسیر کبیر جلد چہارم صفحہ138 - 140 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

رنگوں کی تاثیرات اور ان سے علاج

”اس آیت (سورۃ النحل آیت 14) سے ایک نئے مضمون کو شروع کیا اوررنگوں کے

اختلاف کو پیش کیا کہ وہ بھی تاثیرات رکھتے ہیں اور انسان ان سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔ قرآن کریم کیسا عظیم الشان کلام ہے جوان حکیمانہ امور کو اس زمانہ میں بیان فرماتا ہے جبکہ دنیا ان سے کلی طور پر ناواقف تھی۔ رنگوں کی تاثیرات کی دریافت عملی طورپر موجودہ زمانہ میں ہوئی ہے۔ حتی کہ بنفشی شعاعوں اور ماوراء بنفشی شعاعوں اور کئی قسم کی دوسری شعاعوں کی دریافت سے بیماریوں کے علاج میں غیر معمولی مد دملی ہے اور طب میں بھی ایک نیا باب علاج باللّٰــون کا کھل گیا ہے۔ یعنی مختلف رنگوں کی بوتلوں میں پانی رکھ کر اور سورج کی شعاعوں کے مقابل پر رکھ کر خالی پانی کو دوا کی صورت میں بدل دیاجاتا ہے۔ گویہ طریق علاج اب تک علمی حد تک نہیں پہنچا۔ مگر اس کے بعض فوائد ناقابل انکار ہیں۔ ان کے علاوہ یہ امر تجربہ شدہ ہے کہ ایک ہی قسم کی اشیاء رنگ کے اختلاف کی وجہ سے مختلف تاثیرات ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً توت ہے۔ اس میں سے سفید گلے میں خراش پیدا کرتاہے اور سیاہ توت خناق جیسی مرض میں مفید ہوتا ہے۔ صندل سفید اور سرخ تاثیرات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بعض امور میں قوی یاضعیف ہو تے ہیں۔ یہی حال اَور سینکڑوں اشیاء کا ہے کہ چیز ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن رنگ کے تغیر سے اس کے فوائد میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ بہت سی چیزوں کے فوائد معلوم ہوگئے ہیں اوربہت سی کے ابھی مخفی ہیں۔ مگر اس حد تک اس علم کا انکشاف ہوچکا ہے کہ رنگوں کی تاثیرات کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ موجودہ طب میں تو مختلف رنگوں سے بعض شدید بیماریوں کاعلاج کیاجاتاہے۔ اگر زرد رنگ کی اکری فیلیوین بیرونی زخموں کے لئے مفید ہے تو مرکیوروکروم اندرونی زخموں کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح اور کئی رنگ ہیں۔ میں نے ایک دفعہ اکری فلیوین کودیکھ کرخیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے زرد رنگ کی تاثیر زخموں کے لئے اچھی ہوتی ہے اوراسی وجہ سے پرانے زمانہ میں زخموں کے علاج کے لئے ہلدی کو بکثرت استعمال

کیا جاتا تھا۔ اس خیال سے میں نے ہلدی کا رنگ نکال کر زخموں کے لئے ایک ڈاکٹر کو دیا۔ انہوں نے تجربہ کرکے بتایا کہ گو اکری فلیوین جیسی تاثیر تو نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ملتی ہوئی تاثیر آپ کی دوا میں ضرور تھی۔ اس فرق کی وجہ میں نے یہ سمجھی کہ اس حد تک میں اس کا جوہر نہیں نکال سکا جس حد تک جرمنوں نے نکال لیا ہے۔ ورنہ بات وہی ہے۔ غرض رنگوں کی تاثیرات ایک ثابت شدہ حقیقت ہیں۔ گو اب تک یہ علم مکمل نہیں ہوا۔ قرآن کریم اس کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور توجہ دلاتا ہے کہ اجرام تو الگ رہے ان کے رنگ تک تمہارے فائدہ میں لگے ہوئے ہیں اور کیسی کیسی باریک راہوں سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری جسمانی ترقی کے سامان پیدا کئے ہیں۔ مگر تم اب بھی نہیں سمجھتے کہ روحانی ترقی کے لئے بھی ویسے ہی وسیع بلکہ ان سے بھی زیادہ وسیع سامان پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔“

(تفسیر کبیر جلد چہارم صفحہ 141 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

سائنس کی مادّہ پر تحقیق کی ناکاملیت

”مجھے یاد ہے 1946ء میں جب ہم نے قادیان میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے افتتاح کے لئے ڈاکٹر سر شانتی سر ذب صاحب بھٹنا گر ڈاکٹر سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ گورنمنٹ آف انڈیا کو بلوایا تو انہوں نے تقریر کرتے ہوئے یہی کہا کہ آج سائنسدان کے غرور کا سار اس قدر نیچا ہو چکا ہے کہ وہ ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ سائنس ان اشیاء کی بھی مناسب تشریح کر سکتی ہے جو ظاہری طور پر ہمیں نظر آتی ہیں اور جب زمین و آسمان میں اس قدر اسرار پائے جاتے ہیں کہ سائنس اپنی تمام ترقی کے باوجود ابھی مادیات میں سے بھی ایک بہت چھوٹے سے حصے کی تشریح کر سکی ہے۔ تو پھر اس وسیع کائنات کو جس

وجود کے لئے ایک خادم کے طور پر پیدا کیا گیا ہے اس کی پیدائش کو عبث قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔"

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ320 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

"سورج کی صفت وھّاج بتا کر اُس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ سورج کی روشنی اور گرمی ذاتی ہے۔ چاند وھّاج نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے کہ اس میں اتّقاد نہیں ہے۔ آگ کی طرح جلنے والا سورج ہی ہے۔ سورج کے اندر خدا تعالیٰ نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اس میں ریڈیم موجود ہے کششِ ثقل کے ماتحت جب اس کے ذرّے اندر کی طرف کھنچتے ہیں تو تیز روشنی اور گرمی پیدا ہوتی ہے اور ان ذرّوں کے اندر کی کشش کی وجہ سے اس سے مستقل آگ پیدا ہوتی رہتی ہے۔

سورج کی صفت وھّاج بھی کتنی ظاہر ہے۔ کروڑوں کروڑ میل پر سورج ہے یعنی نو کروڑ میل کے قریب دنیا سے اس کا فاصلہ ہے مگر جب اس کی گرمی یہاں پہنچتی ہے تو گرمیوں کے موسم میں کئی لوگ اس کو برداشت نہیں کر سکتے اور وہ مر جاتے ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے لاہور کے متعلق یہ خبر آئی تھی کہ وہاں گرمی کی شدّت کی وجہ سے گھوڑے چلتے چلتے گر کر مر جاتے تھے۔ نیز امریکہ سے خبر آئی تھی کہ گرمی کی وجہ سے درجنوں آدمی پاگل ہوئے اور بلند مکانوں پر سے چھلانگ مارنے پر تیار ہو گئے۔ گویا سورج کو اللہ تعالیٰ نے وھّاج بنایا ہے یعنی دور دور تک اس کی گرمی پہنچتی ہے۔ لُغت میں اَلْوَھَجُ مِنَ النَّارِوَالشَّمْسِ کے معنوں میں لکھا ہے کہ حَرُّھُمَامِنْ بَعِیْدٍ یعنی سورج یا آگ کی گرمی جو بہت دور سے محسوس ہوتی ہو۔ گویا سِرَاجًا وَّھَاجًا میں دو اشارے کئے گئے ہیں۔ اوّل یہ کہ سورج کی روشنی اور گرمی ذاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی گرمی بہت دور سے محسوس

ہوتی ہے۔"

(تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ 21-22 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

Big Bang Theory اور قرآن حکیم

"فرماتا ہے کیا ان کافروں کو معلوم نہیں کہ آسمان اور زمین جڑے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو چیر کر الگ کردیا اس میں پیدائش عالم کی ایک ایسی حقیقت بیان کی گئی ہے جو اس صدی سے پہلے لوگوں کو معلوم نہیں تھی اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی کرہ فلکی تیار ہوتاہے تو اس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ذرات کا ایک وسیع ڈھیر فضا میں جمع ہوجاتاہے۔ آہستہ آہستہ وہ سمٹنا شروع ہوجاتا ہے۔ جب اس کے درمیان ذرات کچھ زیادہ سمٹ جاتے ہیں تو وہ چکر کھانے لگ جاتے ہیں اور ان کے ارد گرد کامادہ دھکا کھا کر دور جاپڑتاہے اسی طرح پیدا ہونے والے نظام ہائے فلکی میں سے ایک نظام شمسی ہے جس میں ہمارا کرہ ارض واقع ہے۔ نظام شمسی کے عالم وجود میں آنے کے متعلق جتنے بھی نظریات سائنسدانوں نے آج تک پیش کئے ہیں ان میں کم وبیش اس حقیقت کا اقرار موجود ہے کہ کرہ ارض اپنی موجودہ شکل سے پہلے سورج یاسورج جیسے ایک ستارے کا حصہ تھا۔ تازہ ترین نظریہ جس کی تصریح فریڈ ہائل (کیمبرج یونیورسٹی) نے کی ہے یہ ہے کہ یہ ستارہ ہمارے سورج کاہمراہی ایک SUPER NOVA تھا اور اس کے پھٹنے سے سیارے عالم وجود میں آئے حتی کہ زمین ایک علیحدہ وجود کی شکل میں ظاہر ہوئی زمین میں سے بعد میں پانی کے بخارات پید اہوئے اور پانی کے وجود سے آگے زند گی کاوجود پیدا ہوا۔

(دی نیچر آف دی یونیورس مصنفہ فریڈہائل 90 - 92)

اللہ تعالیٰ انہی حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتاہے کہ کیا اس نظارہ کو دیکھ کر یہ ایمان نہیں لاتے آخر دنیا کیوں باربار پیدا کی جارہی ہے۔ کیوں زندگی پیدا کرنے کے لئے بادلوں سے پانی اتارا جاتاہے۔ دنیا کابار بار پیدا کرنا اور بادلوں سے متواتر پانی کا اترنا اور اس سے زندگی کاپیدا ہونا بتاتاہے کہ یہ دنیا بلاوجہ نہیں پیداہوئی۔ اس کو کسی بڑی غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس غرض کوپورا کرنے کےلئے روحانی پانی کاآسمان سے اترتے رہنا بھی ضروری ہے تاکہ ہرطبقہ کے لوگ اپنی روحانی زندگی کے لئے اس سے سامان حاصل کرتے رہیں۔‘‘

(تفسیر کبیر جلدپنجم صفحہ 514 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

پہاڑوں کی پیدائش
اور ان کے کام اور آج کی سائنسی دریافتیں

’’فرماتا ہے ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے ہیں تاکہ وہ انسانوں سمیت تہ وبالا نہ ہوجائے یعنی پہاڑوں کی غرض یہ ہے کہ زمین اپنی تمکنت کی حالت پر قائم رہے کیونکہ علم طبقات الارض سے ثابت ہے کہ زمین اندر سے اب تک بھی گرم ہے لیکن شروع پیدائش میں زیادہ گرم تھی یعنی تغیرات کے نتیجہ میں جب زمین کی گرمی نے اندر کی چھپی ہوئی چٹانوں کو گلا دیا اور بہت سی گیس پیداہو گئی تو گیس نے زور مار کرباہر نکلنا چاہا اور اس نکلنے کی کوشش سے زلزلہ آیا اور آتش فشاں پہاڑ پھوٹے۔ اسی طرح پہاڑوں کے عالم وجود میں آنے میں زمین کے اندرونی حصہ کی سطح پر قشری حصوں کے توازن (ISOSTASY) کو بھی دخل ہے اس لحاظ سے پہاڑ گویا سطح زمین کے توازن کاذریعہ بھی ہیں اور زمین کے اندر

پید اہونے والے معمولی تغیرات کو زمین کی سطح پر کسی بڑے انقلاب کاموجب بننے سے روکتے ہیں سوائے ایسے استثنائی واقعات کے جوزمین پر ایک قیامت کی طرح وارد ہوسکتے ہیں اور جن کا ثبوت کرہ ارض کی گذشتہ تاریخ سے ظاہر ہے جو زمین ہی کے موجودہ آثار سے معلوم ہوئی ہے۔ پس پہاڑ زمین کو تہ و بالا ہونے سے بچاتے بھی ہیں اور ان کے بعض حصے آتش فشانی کی شکل میں زمین کی اندرونی طاقتوں کا نقشہ بھی پیش کرتے رہتے ہیں۔

(دیکھو مارولز اینڈ مسٹر یز آف سائنس مصنفہ ایلی سن ہاکس ایف۔ آر۔ اے۔ ایس زیر عنوان کرسٹ آف دی ارتھ نیز دیکھیں انسائکلوپیڈیابرٹینکا زیر عنوان جیالوجی)

اللہ تعالیٰ ان مادی پہاڑوں کاذکر کرتے ہوئے فرماتاہے کہ روحانی عالم کے اندر جو گرمی بھری ہوئی ہے وہ بھی جوش میں آکر آتش فشاں پہاڑوں کی طرح دنیاپر تباہی لاتی ہے۔ لیکن پھر ہم روحانی پانی کے ذریعہ سے اس آگ کو ٹھنڈا کردیتے ہیں اور کچھ سبزہ زار میدانوں والے پہاڑ ظاہر ہو جاتے ہیں یعنی اولیاء اللہ۔

پھر فرماتاہے کہ ہم نے ان پہاڑوں کے درمیان بڑے بڑے کھلے راستے بنائے ہیں تاکہ لوگ ان پرچل کر فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ ابتداء تاریخ سے پتہ چلتاہے کہ لشکروں کی نقل و حرکت ہمیشہ پہاڑی رستوں کے ذریعہ ہی ہوا کرتی تھی کیونکہ میدانوں میں رستوں کاپہچاننا مشکل ہوتاہے۔ لیکن پہاڑوں کے اندر قدرت نے جو خود بخود وادیاں اور رستے بنائے ہوئے ہوتے ہیں ان کا پہچاننا آسان ہوتاہے اور دور دور کی قومیں ان رستوں کے ذریعہ آسانی کے ساتھ ادھر ادھر آجاسکتی ہیں۔ فرماتاہے جس طرح مادی دنیامیں تمہیں یہ نظارہ نظر آتاہے اسی طرح روحانی پہاڑوں کی ہدایت کے ساتھ لوگ روحانی سفر طے کرتے ہیں اور اس

طرح مادی اور روحانی سلسلہ آپس میں متوازی چلتا چلا جاتا ہے۔“

(تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ 515 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

نباتات میں جوڑے

”(سورۃ طٰہٰ آیت 54) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نباتات کے جوڑے ہیں۔ اس مسئلہ کا سوائے چند ایک چیزوں مثلاً کھجور کے آج سے سو سال قبل کسی کو علم نہیں تھا مگر اب بے شمار نباتی چیزوں کے جوڑے ثابت ہو چکے ہیں جو قرآن کریم کی صداقت کا ایک عظیم الشان ثبوت ہے۔“

(تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ 432 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

دنیا میں ڈیماکریٹک حکومتوں کا قیام

اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب نیلی آنکھوں والے یعنی یوروپین لوگ یہ پیشگوئی پڑھیں گے تو کہیں گے کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ عیسائی حکومتیں تباہ ہو جائیں گی۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو ہمارے ڈیوک اور ایمپرر اور کنگ کہاں جائیں گے؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس تباہی کے آنے سے پہلے ہی ان کو ختم کر دیا جائے گا اور تمام ملکوں میں ڈیماکرسی قائم ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آہستہ آہستہ لوگ قرآن لانے والے کی آواز سننے لگ جائیں گے جس کی تعلیم میں کوئی کمی نہیں۔ اور رحمٰن خدا کی آواز بلند ہونے لگ جائے گی اور شرک کی آواز دھیمی پڑنے لگ جائے گی اور یا تو ترقی کے لیئے عیسائی ہونا بڑی سفارش سمجھا جاتا تھا اور یا اس زمانہ میں ترقی کے لئے مسلمان ہونا

سفارش سمجھا جائے گا۔

مسلمان ہونے کا نتیجہ ہم نے اس بات سے نکالا ہے کہ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ شفاعت اسی کو فائدہ دے گی جس کے لئے رحمن خدا اجازت دے گا اور جس کے متعلق بات کہنے پروہ راضی ہوگا اور قرآن کریم میں مسلمانوں کے متعلق آتا ہے کہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ (مجادلہ:23) کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ پس رَضِیَ لَہٗ قَوۡلًا میں مسلمانوں کا ذکر ہے کہ اس وقت مسلمان ہونا ہی ترقی کا سب سے بڑا معیار سمجھا جائے گا۔"

(تفسیر کبیر جلد پنجم صفحہ467 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

(روزنامہ الفضل آن لائن ایڈیشن مطبوعہ 18 اکتوبر 2022ء لندن)

قسط 7
اجتماعی منہج / رجحان

اس رجحان تفسیر کے بارہ میں ڈاکٹر ذہبی لکھتے ہیں۔

”اس زمانہ میں علم تفسیر ادبی اور اجتماعی حوالہ سے اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ادبی اجتماعی منہج اسی زمانہ میں سامنے آیا ہے۔۔۔اس میں قرآنی نصوص کو زندگی اور اس کے گزارنے کے طریقوں معاشرتی اقدار کے فروغ اور انسانی عمرانی ضروریات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔“

(التفسیر والمفسرون، جلد ثانی صفحہ478 مطبوعہ دار الحدیث القاہرہ 2012ء)

اسسٹنٹ پروفیسر محمد فاروق حیدر (شعبہ علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی۔ لاہور) اپنے تحقیقی مقالہ بعنوان جدید تفسیری ادب محرکات و رجحانات میں اس منہج کے بارہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

”ان سب تفاسیر (سر سید احمد خان کی تفسیر القرآن، سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن، مفتی محمد شفیع کی معارف القرآن اور امین احسن اصلاحی کی تدبر قرآن۔ناقل)کے تالیف کیے جانے کے خاص عوامل و محرکات ہیں جن کا رنگ نہ صرف ان مفسرین کی شخصیات میں بلکہ ان کی کتب تفاسیر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی کو مسلمانوں کی زبوں حالی کی فکر ہے اور اس ضمن میں وہ مسلمانوں کی نجات جدید علوم کو سیکھنے میں تصور کرتا ہے۔ کسی نے قرآن مجید کی تفسیر کو عام فہم اور آسان انداز میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ جدید نسل میں انقلابی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ کسی نے تفسیر میں منقولات اور سلف کے

اقوال پر اعتماد کرتے ہوئے سماجی اور فقہی مسائل کو موضوع بحث بنایا اور قاری کے ذہن میں پیدا ہونے والے بہت سے ممکنہ سوالات کے جوابات دیے۔"

(جدید تفسیری ادب محرکات و رجحانات از محمد فاروق حیدر جہات الاسلام جلد 9 جولائی دسمبر 2015ء شمارہ نمبر 1 صفحہ 18)

اجتماعی منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

- التحریر والتنویر من التفسیر لمحمد الطاھر المحمد المعروف بہ ابن عاشور (1879ء تا 1973ء)
- تدبر قرآن از امین احسن اصلاحی (1904ء تا 1957ء)

تفسیر کبیر میں اجتماعی منہج کی چند مثالیں
ایک معاشرہ کی ترقی کی ضمانت

"اوپر کی آیات (الفجر آیت 18 تا 21) میں چار امور بیان کیے گئے ہیں۔ جو کفار میں پائے جاتے تھے اور یہی چار امور ایسے ہیں جن سے قومیں تباہ ہوتی ہیں۔

اوّل: یتامیٰ کی خبر گیری نہ کرنا۔ فرماتا ہے ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی انعام ملتا ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے حضور خاص شان رکھتے ہیں اور جب ان پر اس رنگ میں ابتلاء وارد ہوتا ہے کہ ان کی مالی حالت ناقص ہو جاتی ہے اور ان پر تنگ دستی کے ایام آ جاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں خدا نے ہماری اہانت کر دی۔ گویا دونوں صورتوں میں وہ عزت اپنی طرف منسوب کرتے ہیں۔ عزت آتی ہے تو کہتے ہیں

ہمارا اکرام ہونا ہی چاہیے تھا اور اگر اہانت آتی ہے تو کہتے ہیں ہماری تو عزت ہونی چاہیے تھی خدا نے غلطی سے ہمیں ذلیل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان امور کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ بات درست نہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ تمہاری تباہی کے سامان تمہارے اندر ہی موجود ہیں اور انہی کے ذریعہ سوط عذاب نازل ہوا کرتا ہے یعنی اندرونی طور پر بعض ایسی قوتیں ہوتی ہیں جو انسان کوتباہی کی طرف لے جاتی ہیں اور تباہی کے وہ سب موجبات تم میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے اگر تم پر تباہی نہ آئے تو اور کس پر آئے۔ چنانچہ قومی تباہی کے چار بڑے بڑے اسباب بیان کئے گئے ہیں جن میں سے پہلا اور اہم سبب یتامیٰ کی خبر گیری نہ کرنا ہے۔ بظاہر یہ ایک روحانی اور دینی کام معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قومی ترقی اور اس کے تنزّل کے ساتھ اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اگر یتامیٰ کی خبر گیری نہ کی جائے، ان کی پرورش کو نظر انداز کر دیا جائے اور ان کودربدردھکے کھانےپر مجبور کیا جائے تو دنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ دنیا میں بڑے سے بڑے کام قربانی کو چاہتے ہیں اور جب تک بڑی بڑی قربانیاں نہ ہوں اس وقت تک بڑے بڑے کام بھی نہیں ہوتے اور بڑی بڑی قربانیاں دوہی قسم کی ہوتی ہیں یا مالی یا جانی۔ مگرہم دیکھتے ہیں انسان اپنے لئے تکلیف برداشت کر لیتا ہے لیکن جب اسے خیال آتا ہے کہ میرے بال بچوں کا کیابنے گا تو بہت سے لوگ بزدل بن جاتے ہیں اور قربانی کے میدان سے اپنے قدم کو پیچھے ہٹا لیتے ہیں۔ اگر کسی قوم میں یتامیٰ کی خبر گیری پوری طرح پائی جاتی ہو تو یہ ممکن ہی نہیں کہ جانی اور مالی قربانیوں کے وقت اس قوم کا کوئی ایک فرد بھی پیچھے رہے اور اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش نہ کرے بلکہ وہ ہنستا ہواآگے بڑھے گا اور ہر قسم کے شدائد کو خوشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ اگر لوگ روزانہ اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھیں کہ فلاں شخص مر گیا تو اس کے یتیم بچوں کو فلاں امیر لے گیا اور اس

نے اپنے بچوں کی طرح اپنے گھر میں رکھ لیا وہ ان میں اور اپنے بچوں میں کوئی فرق نہیں کرتا، وہ انہیں تعلیم دلا رہا ہے، انہیں اچھے کھانے کھلا رہا ہے، انہیں اچھا سے اچھا لباس پہنا رہا ہے تو جب بھی قربانی کا سوال پیدا ہو گا ہر شخص آگے بڑھے گا اور کہے گا اگر میری جان بھی جاتی ہے تو بے شک جائے مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ فلاں شخص مر گیا تھا تو اس کے بچے فلاں قومی بھائی لے گیا اور اس نے انہیں اپنے بچوں کی طرح پالنا شروع کر دیا۔ فلاں شخص مر گیا تو اس کے بچوں کو فلاں شخص لے گیا اور ان کے اخراجات کا متکفّل ہو گیا اگر میں بھی مر گیا تو کیا ہوا میرے بچوں کی قوم نگران ہو گی اور وہ مجھ سے زیادہ بہتر رنگ میں ان کی تربیت کا فرض سرانجام دے گی۔ یہ احساس اگر ہر فرد کے دل میں پیدا ہو جائے اور یتامیٰ کی خبر گیری قومی طو پر کسی جماعت میں پائی جائے تو وہ جماعت کبھی مٹ نہیں سکتی۔ وہ جماعت کبھی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کر سکتی۔ قربانیوں سے ہچکچاہٹ محض اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مر گئے تو ہمارے بچے خاک میں مل جائیں گے ان کا کوئی نگران نہیں ہو گا۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہو گا۔ لوگ انہیں ڈانٹیں گے، ان سے نوکروں کی طرح کام لیں گے، ان کو بوٹ کی ٹھوکروں سے ماریں گے، انہیں کھانے کے لئے سوکھے ٹکڑے پہننے کے لئے پھٹے پرانے کپڑا دیں گے ان کے سروں پر محبت کا ہاتھ نہیں رکھیں گے، ان کو پیار کی نگاہوں سے نہیں دیکھیں گے، انہیں بات بات پر جھڑکیں گے، وہ روئیں گے تو انہیں چپ کرانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ انہیں ضرورتیں پیش آئیں گی تو وہ ان کو پورا نہیں کریں گے۔ یہ خیالات جب کسی شخص کے دل اور دماغ پر حاوی ہوتے ہیں تو اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اس کا بدن کپکپا جاتا ہے اور وہ جان دینے سے گھبراتا ہے اور اس میدان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح مالی قربانی کا وقت آئے تو وہ گھبرا جاتا ہے اور

اسے اپنے بچوں کی پرورش کا خیال روپیہ کو بلادریغ خرچ نہیں کرنے دیتا۔ اپنی زندگی کی تو اسے پرواہ نہیں ہوتی سمجھتا ہے جس طرح بھی ہو گا میں اپنے بچوں کی پرورش کر لوں گا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے دل میں یہ خیال بھی آ جاتا ہے کہ اگر مال لٹانے کے بعد میں مر گیا اور میرے بچوں کے لئے کوئی چیز باقی نہ رہی تو ان کا بعد میں کیا حال ہو گا؟ اس وقت اگر وہ سمجھتا ہے کہ قوم نے میرے بچوں کی پرورش نہیں کرنی تو وہ بزدل بن جاتا ہے اور قربانی کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ ڈرانسان کو اپنی موت کا نہیں ہوتا بلکہ سب سے زیادہ ڈر اسے اس بات کا ہوتا ہے کہ میری موت کے بعد میرے بچوں کا کیا حال ہو گا۔ یہ ایک جذباتی سوال ہے جو اس کے اندر ایک کشمکش اور ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے ارادوں میں تعطّل اور اس کی خواہشات میں جمود کی کیفیت رونما ہو جاتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ قوم کے کئی بچے یتیم ہیں مگر ان کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دروازوں پر جا جا کر اپنے لئے آٹا مانگتے پھرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ سمجھتا ہے اگر میں مر گیا تو میرا بچہ بھی کل اسی طرح بھیک مانگنے پر مجبور ہو گا۔ پھر وہ ایک اور نظارہ دیکھتا ہے تو اس کا قلب اور بھی سہم جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے چند یتیم آٹا مانگنے کے لئے کسی کے دروازہ پر آئے انہوں نے دستک دی اور کہا ہمیں آٹا دیا جائے۔ گھر وہ ان کی آواز کو سنتا ہے تو بڑ بڑا کر کہنے لگ جاتا ہے ان لوگوں نے تو ہمارے کان کھا لئے ہیں۔ روز آٹا روز آٹا۔ وہ یہ فقرہ سنتا ہے تو اس میں اور بھی زیادہ بزدلی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے اگر میں مر گیا تو میرا بچہ اوّل تو بھیک مانگنے پر مجبور ہو گا اور پھر لوگوں کا سلوک اس سے یہ ہو گا کہ وہ تو آٹا مانگے گا اور لوگ اسے کہیں گے تو نے ہمارے کان کھا لئے۔ پھر وہ دیکھتا ہے کہ فلاں شخص

مر گیا ہے تو اس کے یتیم بچے فلاں گھر میں برتن مانجھ مانجھ کر گزارہ کر رہے ہیں۔ وہ اپنی نظر کو وسیع کرتا ہے اور اپنی قوت فکریہ پر زور ڈالتا ہے۔ تو کہتا ہے جب میں مر جاؤں گا میرے بچے سے بھی اس قسم کا کام لیا جائے گا۔ اس پر اس کی بزدلی کا پارہ اور زیادہ اوپر چڑھ جاتا ہے بلکہ اگر کوئی خود ہی یتیم پر ظلم کر رہا ہو تو بھی اس میں بزدلی آ جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے جو سلوک آج میں دوسروں کے یتیم بچوں سے کر رہا ہوں وہی سلوک میرے مرنے کے بعد لوگ میرے بچے کے ساتھ کریں گے۔ پس یاد رکھو! یتیم کی خبر گیری کرنا صرف نیکی اور تقویٰ ہی نہیں بلکہ قوم کے کیریکٹر کو بلند کرنا اور اسے قربانیوں پر زیادہ سے زیادہ دلیر بنانا ہے۔ جو قوم یتامیٰ سے حسن سلوک نہیں کرتی وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

میں نے ایک دفعہ گھر میں نصیحت کی کہ یتامیٰ سے ایسا سلوک ہی کرنا چاہئے جیسے اپنے بچوں سے کیا جاتا ہے۔ اگر اس رنگ میں ان سے سلوک نہیں کیا جاتا تو قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ تم نے کسی یتیم کی پرورش کی ہے میں نے کہا میں بعض یتامیٰ کا خرچ خود دیتا ہوں مگر پھر بھی میری بعض بیویاں ان سے اس طرح کام لیتی ہیں جس طرح نوکروں سے کام لیا جاتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ ان سے بالکل کام نہ لیا جائے اگر ان سے کام نہیں لیا جائے گا تو وہ آوارہ ہو جائیں گے میں صرف یہ کہتا ہوں کہ ان سے ایسا ہی کام لیا جائے جو اپنے بچوں سے بھی لے لیا جاتا ہے اور اگر کوئی کام ایسا ہو جو ہم اپنے بچوں سے کروانے کے لئے تیار نہ ہوں تو ہمیں وہ کام کسی یتیم سے بھی نہیں لینا چاہیے۔ بہر حال میں نے گھر میں نصیحت کی کہ یہ روپیہ تو میں دیتا ہوں مگر کام کی ذمہ داری تم پر ہے تمہیں چاہئے کہ ایسے رنگ میں ان سے کام مت لو گویا وہ تمہارے نوکر ہیں۔

میری نصیحت کے بعد ام طاہر مرحومہؓ نے ایک یتیم بچہ پالا بعد میں تو اس کی حالت ایسی اچھی ثابت نہیں ہوئی مگر بہرحال انہوں نے اس بچے کو اسی طرح پالا جس طرح وہ اپنے بچوں کو پالتی تھیں اور انہوں نے کسی قسم کا فرق پیدا نہ ہونے دیا۔

اس بارہ میں نہایت ہی اعلیٰ نمونہ عزیزم مرزا مظفر احمد نے دکھایا ہے جو میرے بھتیجے ہیں۔ بنگال کے وہ فاقہ زدہ لوگ جو لاکھوں کی تعداد میں وہاں ہلاک ہوئے ہیں ان میں سے ایک کی یتیم بچی لے کر انہوں نے پرورش شروع کی ہے اور اس عمدگی اور خوبی کے ساتھ وہ اس کی پرورش کر رہے ہیں کہ اس میں اور ان کی اپنی لڑکی میں کوئی بھی فرق نظر نہیں آتا۔ وہ اس کو مار پیٹ لیتی ہے اور یہ اس کو مار پیٹ لیتی ہے، دونوں کے بالکل ایک جیسے کپڑے ہوتے ہیں، ایک جیسا دونوں کو کھانا کھلاتے، ایک جیسی دونوں کو تعلیم دلاتے ہیں، اور ایک جیسی دونوں کی نگرانی رکھتے ہیں۔ ان کی لڑکی اس لڑکی کو باجی کہتی ہے اور اس کا احترام کرتی ہے اور یہی چیز ہے جسے یتیم کا پالنا کہتے ہیں۔ یتیم کا پالنا یہ نہیں کہ کسی کو گھر میں نوکر کے طور پر رکھ لیا، سارا دن اس سے کام لیتے رہے، کھانے کو اسے روکھی سوکھی روٹی دے دی، پہننے کے لئے پھٹا پرانا کپڑا دے دیا، ذرا غلطی ہوئی تو گالیاں دینے لگ گئے یا تھپڑوں سے اس کی مرمت شروع کر دی اور پھر یہ خیال کر لیا کہ ہم یتیم کی پرورش کر رہے ہیں اسے اسلامی اصطلاح میں قطعًا یتیم پروری نہیں کہا جاتا۔ یتیم پروری یہ ہے کہ انسان اپنے بچوں کی طرح دوسرے کے یتیم بچہ کو رکھے اور اپنے سلوک میں ذرا بھی فرق نہ آنے دے۔ محض کسی کو روٹی کھلا دینا اور بات ہے اور یتیم پروری اور چیز ہے۔ قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ اے لوگو! تم یتیم کا اکرام نہیں کرتے تھے یہ نہیں کہا لَّا تُطْعِمُوْنَ الْيَتِيْمَ اے

لوگو! تم یتیم کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ اگر محض کھانے کا ذکر ہوتا تو یہاں اکرامؔ کا لفظ نہ ہوتا بلکہ اِطْعَام کا لفظ ہوتا۔ اکرام کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکھا جانا صاف بتا رہا ہے کہ الٰہی منشاء یہ ہے کہ یتیموں کی ایسے رنگ میں پرورش کی جائے کہ ان کا احترام مدنظر ہو یہ نہ ہو کہ صدقہ کے طور پر ان کو روٹی دی جا رہی ہو۔

میں نے قادیان میں ایک دفعہ یتیم خانہ بنایا تھوڑے دنوں کے بعد ہی مجھے پتہ لگا کہ ان یتیموں سے سارا دن کام لیا جاتا ہے۔ کام لینا منع نہیں لیکن ہمیں ان سے اتنا ہی کام لینا چاہئے جتنا ہم اپنے بیٹے سے کام لیتے ہیں یہ نہ ہو کہ ہمارا بیٹا تو آرام سے بیٹھا رہے اور کام کا بوجھ یتیم پر ڈال دیا جائے محض اس لئے کہ اس کا باپ زندہ نہیں اس کی ماں زندہ نہیں اور وہ اب دوسروں لوگوں کے رحم پر ہے۔ اسے بیٹوں کی طرح رکھا جائے، بیٹوں کی طرح اس سے کام لیا جائے اور پھر اگر اس میں اور اپنے بیٹے میں کبھی لڑائی ہو جائے تو بے شک یہ اس کو مارپیٹ لیں اور وہ ان کو مارپیٹ لے اس وقت ماں اسے یہ نہ کہے کہ خبردار میرے بیٹے پر ہاتھ اٹھایا تو تجھے مار مار کر سیدھا کر دوں گی۔ اگر اس طرح کسی یتیم کو رکھا جائے تو بے شک کسی غلطی پر اسے مار بھی لیا جائے اس میں کوئی حرج نہیں آخر ہم اپنے بچے کو بھی بعض دفعہ مار لیتے ہیں۔ پھر اگر کسی یتیم کو اس کی کسی غلطی پر بالکل اس طرح جس طرح ہم اپنے بچوں کی اصلاح کے لئے انہیں مارتے ہیں اگر کبھی مار لیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں مگر بہرحال اس کی عزت نظر انداز نہیں ہونی چاہئے۔

قرآن کریم صرف یتامیٰ کو کھانا کھلا ضروری نہیں سمجھتا بلکہ فرماتا ہے قومی ترقی کے لئے یہ نہایت ضروری امر ہے کہ یتیم کو عزت سے رکھا جائے، اگر یتامیٰ کا اکرام قوم میں نہیں پایا جاتا تو خواہ تم ہزارہا لوگوں سے کہو کہ جاؤ اور خدا کی راہ میں مر جاؤ۔ جاؤ!

اور اپنی جان کو قربان کر دو۔۔۔ وہ کہیں گے ہم چلے تو جائیں گے مگر ایسا نہ ہو کہ مر جائیں اور ہمارے بچوں کو تکلیف اٹھانی پڑے۔ لیکن اگر وہ یہ دیکھیں کہ ہماری زندگی اور ہماری موت بچوں کی پرورش کے لحاظ سے برابر ہے ہمارے مرنے کے بعد بھی یہ اسی طرح رہیں گے بلکہ موجودہ حالت سے بھی ہزار گنا بڑھ کر ان کی پرورش کے سامان ہوں گے تو بےشک تم قوم کے ایک ایک فرد کو کٹواتے جاؤ، ایک ایک فرد کو مرواتے جاؤ کوئی ایک شخص بھی اپنے قدم کو پیچھے نہیں ہٹائے گا اور خوشی سے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کر دے گا س۔ غرض یہ ایک نہایت ہی عظیم الشان مسئلہ ہے اور جب تک کسی قوم کے افراد اس کو پوری طرح نہ سمجھ لیں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔

دوسری بات خدا تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ تم آپس میں ایک دوسرے کو رغبت نہیں دلاتے کہ غریب آدمی کو کھانا کھلایا جائے۔

اگر غرباء کی خبر گیری نہ ہو تو قومی جنگوں میں کامیابی نہیں ہوتی اور سپاہی بہت کم ملتے ہیں کیونکہ دنیا میں غرباء زیادہ ہوتے ہیں اگر سپاہیوں اور لڑنے والوں کے ذہن میں یہ ہو کہ ہماری قوم ہماری محسن ہے۔ ہم بیمار ہوئے تو اس نے ہمارا علاج کیا۔ ہمارے پاس کپڑے نہ تھے تو اس نے ہمارے لیے کپڑے مہیا کیے۔ ہم بھوکے تھے تو اس نے ہمارے لئے غلّہ مہیا کیا۔ ہم حاجت مند تھے تو اس نے ہماری حاجات کو پورا کیا۔ تو گو کمینے اور رذیل لوگ بھی ہر قوم میں پائے جاتے ہیں مگر بہرحال جو شریف ہوں گے اور یہی طبقہ زیادہ ہوتا ہے وہ کہیں گے جب قوم نے ہمارے ساتھ یہ احسان کیا ہے وہ احسان کیا ہے تو آج ہم قومی ضرورت کے وقت کیوں پیچھے ہٹیں ہم آگے بڑھیں گے اور قوم کے لئے اپنی جانوں کو قربان کر دیں گے لیکن اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بھوکے مرتے رہے مگر

ہمیں کسی نے نہ پوچھا ہم ننگے پھرتے رہے مگر کسی نے ہمارا ننگ نہ ڈھانکا ہم بیمار ہوئے مگر کسی نے ہمارا علاج نہ کیا ہم محتاج ہوئے مگر کسی نے ہماری احتیاج کو رفع نہ کیا۔ تو وہ کہیں گے ہمارے لئے قوم نے کیا کیا تھا کہ آج ہم اس کے لئے قربانی کریں۔ وہ ہم سے بے اعتنائی کرتی رہی ہے آج ہم اس سے بے اعتنائی کریں گے۔ پس غرباء کی خبر نہ کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قربانی کا مادہ لوگوں کے دلوں میں سے کم ہو جاتا ہے اور قومی جنگوں میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔

میں نے قادیان میں دیکھا ہے ہم کوشش کرتے ہیں کہ غرباء کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ ہم ان کے لئے کپڑے مہیا کرتے ہیں، ان کے لئے غلّہ کا انتظام کرتے ہیں، ان کی روپیہ سے امداد کرتے ہیں، ان کو طبّی امداد بہم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور حتی الامکان ان کی تکالیف کو زیادہ سے زیادہ کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بعد بھی گو کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو باوجود اس سارے انتظام کے جماعت پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں لوگوں کا کام صرف یہی ہے کہ ان پر روپیہ خرچ کرتے چلے جائیں ان پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ لیکن پھر بھی اکثریت ایسی ہے جو محسوس کرتی ہے کہ یہ جماعت ہمارے لئے قربانی کر رہی ہے اس لئے قومی ضرورتوں کے وقت ہمیں بھی دوسروں سے زیادہ قربانی کرنی چاہئے۔ چنانچہ وہ لوگ خود بھوکے ہوتے ہیں مگر جب کسی چندہ کی تحریک ہو مزدوری کر کے بھی اس میں ضرور حصّہ لیتے ہیں اور گو وہ اس تحریک کے مخاطب نہیں ہوتے اور ان پر کسی قسم کی ذمہ واری بھی نہیں ہوتی مگر چونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ قوم ہمارے لئے قربانی کرتی ہے اور ہماری ضروریات کا خیال رکھتی ہے اس لئے وہ بھی قربانی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ قومی تحریکات میں حصہ دار بن جائیں۔ پس غرباء کی خبر

گیری کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر قومی جنگ ہو جائے تو چونکہ قوم کی اکثریت غرباء پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے قوم کو کثرت سے کام کرنے والے مل جاتے ہیں۔ ایک کروڑ پتی کی تلوار صرف ایک تلوار کا کام دے سکتی ہے لیکن جنگوں میں ایک تلوار نہیں کروڑوں تلواروں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کروڑوں تلواریں اس وقت تک مہیّا نہیں ہو سکتیں جب تک کہ کروڑوں غرباء کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے اور ان کو پوری طرح مطمئن نہ کیا جائے۔ اگر مساکین کے کھانے پینے کا خیال رکھا جائے تو یہ لازمی بات ہے کہ جب قوم پر کوئی مصیبت آئے گی شریف الطبع لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو گا کہ قوم نے ہم پر احسان کیا تھا اب اس پر مصیبت آئی ہے تو ہم اس کی مدد کریں۔ جیسے انگلستان، امریکہ، روس اور جرمنی وغیرہ ممالک میں موجودہ جنگ میں لاکھوں آدمی کام آئے اور انہوں نے اپنے آپ کو قوم کے لئے قربان کر دیا۔ اس کی وجہ درحقیقت یہی ہے کہ ان قوموں میں غرباء کی پرورش کا احساس زیادہ پایا جاتا ہے ہندوستان میں لوگ فوجی بنتے ہیں وہ یا تو اس لئے فوج میں بھرتی ہوتے ہیں کہ ان کے باپ دادا فوج میں کام کر چکے ہوتے ہیں اور یا پھر اس لئے جاتے ہیں کہ ان کو بعد میں مربّعے مل جائیں۔ قومی احساس ہندوستانیوں میں بہت کم ہوتا ہے۔

پھر اگر غرباء کے کھانے پینے کا خیال رکھا جائے تو ان کے دلوں میں یہ احساس رہتا ہے کہ جو لوگ اپنے اموال میں ہماری ضروریات کا خیال رکھتے ہیں وہ فتوحات میں بھی ہمارا ضرورخیال رکھیں گے اور یہ بھی قوم کی ترقی کا ایک ذریعہ ہوتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ قومی اموال کی ترقی صرف امراء کو ہی نہیں بلکہ ہمیں بھی فائدہ پہنچائے گی۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اموال میں غرباء کے حقوق اس لئے بیان کئے ہیں

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (الحشر:8) تا کہ تم روپیہ کو اس طرح استعمال نہ کرو کہ وہ دولتمندوں میں ہی چکر لگانے لگے بلکہ غرباء کو بھی روپیہ ملے۔ پس غرباء کی خبر گیری کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں جتنی قوم ترقی کرے گی اتنا ہی ہمارا حصہ بڑھتا چلا جائے گا لیکن اگر ان کو حصہ نہ دیا جائے تو وہ کہتے ہیں ہمیں تو حصہ ملنا نہیں قومی اموال کی ترقی امراء کو ہی فائدہ دے گی اس لئے ہم اپنی جانوں کو کیوں ضائع کریں۔

تیسری چیز جس کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے وہ اکْل تراثجو اسراف کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ جب کسی قوم میں اسراف پیدا ہو جائے تو وہ بھی یقینی طور پر تباہ و برباد ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا کہ تمہیں باپ دادا سے مال ملا ہے مگر بجائے اس کے کہ تم اسے ترقی دیتے اور اسے بڑھانے کی کوشش کرتے تم نے اسے تباہ کرنا شروع کر دیا۔ غرض اسراف بھی قومی تنزّل کی ایک بہت بڑی علامت ہے اور اس کے دو بڑے نقصان ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ انسان میں نکمّا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ باپ دادا کی طرح اگر وہ کام کرتا تو نکمّا پن اس میں پیدا نہ ہوتا مگر وہ محنت کو صرف روٹی کمانے کا ذریعہ سمجھ لیتا ہے اور جب اسے باپ دادا کی جائیداد پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے روٹی مل جاتی ہے تو وہ کوئی کام نہیں کرتا۔ جس قوم میں ایسے آدمی پیدا ہو جائیں کہ وہ کوئی کام نہ کریں وہ اس جونک کی طرح ہوتے ہیں جو جسم کا خون چوس لیتی ہے اور اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ مذمت کی جائے۔ اگر کسی قوم میں ہزاروں لوگ بھی کروڑ پتی ہوں لیکن وہ سب کے سب کام کر رہے ہوں اور ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جس کے اندر نکمّا پن پایا جاتا ہو تو وہ قوم کبھی تباہ نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ایک کروڑ پتی بھی ایسا ہے جو باپ دادا کی جائیداد لے کر بیٹھ گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب مجھے کسی کام یا کسی

محنت کی ضرورت نہیں محنت تو اس لئے کی جاتی ہے کہ روٹی ملے میرے پاس روٹی کا کافی سامان ہے میں کیوں محنت کروں تو اس قوم کی تباہی کی بنیادی اینٹ وہ شخص اپنے ہاتھ سے رکھنے والا ہوتا ہے۔ پس محض کسی کروڑپتی کا قوم میں پایا جانا اس کی بربادی کی علامت نہیں کیونکہ گو وہ کروڑپتی ہو گا مگر نکمّا نہیں ہو گا بلکہ کام کر رہا ہو گا۔ نکمّا وہ ہے جو کہتا ہے کہ باپ کا ایک کروڑ روپیہ میرے پاس ہے مجھے اب محنت کی ضرورت نہیں۔ مجھے اب کام کی ضرورت نہیں میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ باپ کے روپیہ پر تصرّف رکھوں جس طرح جی میں آئے کروں۔ یوں تو انگلستان میں بھی کروڑ پتی پائے جاتے ہیں مگر وہ لوگ ایسے ہیں کہ باوجود کروڑ پتی ہونے کے محنت کرتے ہیں اور اپنے روپیہ کو برباد کرنے کی بجائے اس سے کوئی نہ کوئی کارخانہ جاری کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پچاس، سو، دو سو یا ہزار آدمیوں کو مزدوری مل جاتی ہے اور وہ روپیہ قوم کی ترقی کے کام آتا رہتا ہے۔ بے شک وہاں بھی بعض ایسے لوگ ہیں جو بنکوں میں اپنا روپیہ جمع کر دیتے ہیں مگر زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنے روپیہ سے کارخانہ جاری کر دیتے ہیں یا بنکوں میں روپیہ جمع کر کے خود کسی سوسائٹی کے پریذیڈنٹ یا سیکرٹری بن جاتے ہیں اور اس طرح آنریری طور پر قومی خدمات سرانجام دیتے ہیں اس لئے وہ قوم تباہ نہیں ہوتی۔ اس جگہ ایسے لوگوں کا ذکر نہیں بلکہ نکمّے امراء کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنے باپ دادا کے روپیہ کو کھاتے رہتے ہو اور خود ساری عمر نکمّاپن میں گزار دیتے ہو جس قوم میں ایسے منحوس لوگ پیدا ہو جائیں وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ دوسرےؔ خواہ تم اچھا کہو یا برا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں وہ قوم میں ضرور عزت حاصل کر لیتے ہیں اور اس وجہ سے ان سے اتر کر ان کی اولاد کو بھی کچھ نہ کچھ عزت قوم میں حاصل ہو جاتی ہے خواہ دنیا میں کتنی بغاوت ہو جائے، لوگ

بالشوزم کے قائل ہو جائیں پھر بھی یہ بات کبھی مٹ نہیں سکتی کہ جب کوئی شخص قوم میں کوئی خاص اعزاز حاصل کر لیتا ہے تو کچھ نہ کچھ عزت اس کی اولاد کو بھی مل جاتی ہے۔ یہ ایک فطرتی چیز ہے جس کو کوئی شخص بدل نہیں سکتا جس نے کوئی نمایاں کام کیا ہوتا ہے اس کی اولاد خواہ مستحق ہو یا نہ ہو مگر بہر حال اس عزت کا کچھ نہ کچھ حصہ اولاد کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اب یہ لازمی بات ہے کہ جب ایسے لوگومیں سستی پیدا ہو جائے گی تو چونکہ بڑے خاندان ہی لیڈر ہوتے ہیں ان کی سستی کا قوم پر اثر پڑے گا کہ اس کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا جب وہ لوگ جنہیں قوم میں عزت حاصل ہو جن کے ہاتھ میں لیڈری کی باگ ڈور ہو، باپ دادا کی جائیداد پر بیٹھے روٹیاں توڑ رہے ہوں تو یہ قدرتی بات ہے کہ اس قوم میں لیڈر کم ہو جائیں گے۔ بے شک کچھ نئے لیڈر بن جاتے ہیں مگر کچھ باپ دادا کی عزت اور خاندانی وجاہت کی وجہ سے لیڈر سمجھے جاتے ہیں اگر ان میں اس قسم کی سستی پیدا ہو جائے تو ایک قسم کے لیڈر ہی رہ جائیں گے دوسری قسم کے لیڈر نہیں رہیں گے اور اس طرح قوم کے راہنما محدود ہو جائیں گے۔

چوتھی چیز محبت مال ہے۔ مال کی محبت حلال وحرام کا امتیاز اڑا کر انسان کو ظلم کی طرف مائل کر دیتی ہے جس شخص کے دل میں انتہائی طور پر مال کی محبت ہو گی وہ حلال اور حرام میں کوئی امتیاز نہیں کرے گا۔ حلال ذریعہ سے مال آئے گا تو اسے بھی لے لے گا، حرام ذریعہ سے مال آئے گا تو اسے بھی لے لے گا اور جس شخص میں حلال کا امتیاز نہ رہے وہ ظلم پر آمادہ ہو جاتا ہے اور جس قوم میں ظالم پیدا ہو جائیں اس کا شیرازہ کبھی متحد نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک لازمی اور طبعی بات ہے کہ جب انتہائی طور پر مال کی محبت پیدا ہو گی حلال و حرام کی تمیز جاتی رہے گی اور جب حلال و حرام کی تمیز نہ رہے گی تو انسان ظلم سے دریغ

نہیں کرے گا اور جب قوم میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جن کو دوسروں کو لوٹنے میں مزا آتا ہو تو وہ قوم کبھی پنپ نہیں سکتی۔

دوسرے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم صنعتی ترقی سے محروم رہ جاتی ہے جس شخص کے دل میں مال کی شدید محبت ہو وہ بعض دفعہ روپیہ کو کام پر لگانے سے ڈرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ شاید تجارت یا صنعت میں نقصان نہ ہو جائے بہتر یہی ہے کہ میں اس کو اپنے پاس محفوظ رکھوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا مال بھی نہیں بڑھتا اور غرباء کے حقوق کا بھی اتلاف ہوتا ہے۔ فرض کرو دس ہزار روپیہ سے یہ ایک کارخانہ جاری کرتا اور بیس پچیس مزدور اس کارخانہ میں کام کرنے والا ہوتا تو بیس پچیس خاندان اس روپیہ سے پرورش پانے لگ جاتے۔ آگے ایک خاندان میں اگر پانچ پانچ آدمی بھی فرض کر لئے جائیں تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ اس نے دس ہزار روپیہ خرچ کر کے سو سوا سو لوگوں کے لئے مزدوری مہیا کی۔ لیکن اگر وہ روپیہ خزانہ میں جمع کر دیتا ہے تو سو سوا سو آدمیوں کی روٹی ماری جاتی ہے۔ اسی طرح اگر قوم میں دس ہزار مالدار ہوں اور وہ اپنے روپیہ کو خزانہ میں محفوظ رکھیں تو لاکھوں لوگوں کی مزدوری ماری جائے گی اور صنعتی لحاظ سے قوم کو شدید نقصان پہنچے گا۔ پس دوسرا نقصان مال کی محبت کا یہ ہے کہ قوم صنعتی لحاظ سے ترقی سے محروم رہ جاتی ہے۔

تیسرا نقصان یہ ہے کہ حبّ مال کی وجہ سے قومی چندوں میں کمی آ جاتی ہے۔ جب بھی کوئی تحریک ہو مال کی محبت غالب آ جاتی ہے اور قومی تحریکات میں حصہ لینے کے لئے انسان تیار نہیں ہوتا۔

چوتھے اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جن کے دلوں مال کی محبت ہوتی ہے وہ قومی ایثار کے وقت

دشمن کے غلبہ سے ڈر کر غدّار بن جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (آل عمران:141) لڑائی میں کبھی ایک کا پلّہ بھاری ہو جاتا ہے اور کبھی دوسرے کا۔ اونچ نیچ ضرور ہوتی رہتی ہے ایسی حالت میں وہ شخص جس کے دل میں مال کی محبت ہوتی ہے اگر اسے ذرا بھی یہ پتہ لگے کہ دشمن غالب آنے والا ہے تو وہ چوری چھپے دشمن کے ساتھ ساز باز شروع کر دیتا ہے اور اپنی قوم سے غدّاری کرتا ہے محض اس لئے کہ اس کا مال محفوظ رہے۔

حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ انگریز سود لے کر بھی لوٹتے ہیں اور سود دے کر بھی لوٹتے ہیں پھر اس کے متعلق ایک واقعہ سنایا کرتے تھے۔ آپ فرماتے اودھ کی اسلامی حکومت اس طرح تباہ ہوئی کہ پہلے انگریزوں نے لوگوں میں یہ تحریک شروع کر دی کہ اگر تم ہمارے بنک میں اپنا روپیہ جمع کرو تو تمہیں اڑھائی فیصدی نفع دیا جائے گا۔ یہ لالچ اتنا بڑا تھا کہ ان لوگوں نے اپنا تمام روپیہ کلکتہ کے انگریزی بنک میں جمع کرا دیا۔ عورتوں نے اپنے زیورات تک بیچ ڈالے اور روپیہ انگریزوں کے حوالے کر دیا کیونکہ انہیں آئندہ کے متعلق بڑی بڑی امیدیں دلائی گئی تھیں۔ انہیں کہا گیا تھا کہ تمہارا دس لاکھ روپیہ جمع ہوا تو تمہیں پچیس ہزار روپیہ سود دیا جائے گااور پھر تمہارا اصل مال بالکل محفوظ رہے گا جب تم مانگو گے روپیہ واپس دے دیا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا سارے کا سارا روپیہ کلکتہ کے انگریزی بنک میں جمع ہو گیا اس کے بعد انگریزی فوج نے حملہ کر دیا۔ لکھنؤ جو اودھ کی حکومت کا دارالسلطنت تھا وہاں کے بڑے بڑے سرداروں سے انگریزوں نے کہہ دیا کہ خبردار! تم میں سے کوئی شخص بادشاہ کو یہ خبر نہ پہنچائے کہ انگریزی فوج حملہ کے لئے آ رہی ہے اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا جو

روپیہ بنک میں جمع ہے وہ ضبط ہو جائے گا۔ ان غدّار افسروں نے ایسا ہی کیا۔ بادشاہ مرغ لڑوا رہا تھا اور کنچنیوں کے ناچ گانے میں مشغول تھا کہ ایک شخص بول اٹھا اور کہنے لگا کہ حضور سنا ہے انگریزی فوج آ رہی ہے وہ افسر جو اندرونی طور پر انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے انہوں نے اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا اور بادشاہ سے کہا حضور کے اقبال کے سامنے انگریزوں کی کیا مجال ہو سکتی ہے یہ ایک بے وقوف شخص یوں ہی بول پڑا ہے۔ حضور کے آرام اور مزے کا وقت تھا مگر اس نے سارا مزہ خراب کر دیا انگریزوں کی کیا مجال ہے کہ وہ حضور کی شاہی کو نقصان پہنچا سکیں۔

غرض بادشاہ کو انہوں نے ناچ گانوں اور مرغوں کے لڑوانے میں ہی مشغول رکھا اور انگریزی فوج لکھنؤ کے اندر داخل ہو گئی الغرض محبت مال قوم میں غدّاری پیدا کر دیتی ہے اس لئے اگر کوئی قوم ترقی کرنا چاہے تو اسے اپنے افراد کے قلوب میں سے مال کی محبت کو مٹا دینا چاہئے اس کے بغیر وہ حقیقی اور پائدار ترقی حاصل نہیں کر سکتی۔

چونکہ یہاں کفار کا ذکر تھا اور انہیں یہ بتایا جا رہا تھا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہ مضمون بیان کیا کہ تمہاری تباہی کے سامان مہیا کہیں باہر سے نہیں آئیں گے بلکہ تمہارے اندر ہی تمہاری بربادی کے سامان موجود ہیں۔ لیکن محمدؐ رسول اللہ کی قوم کا ہر فرد جانتا ہے کہ اگر میں لڑائی میں مارا گیا تو مجھ سے بڑھ کر شفیق باپ میرے بچوں کے لئے موجود ہے۔ مسکین جانتا ہے ہے کہ اگر محمدؐ رسول اللہ کو طاقت ملی تو مجھے کھانا ملے گا، مجھے کپڑا ملے گا، مجھے بیماری کے وقت علاج میسر آئے گا اور مجھے فتوحات میں برابر کا حصہ ملے گا۔ باپ دادا سے ورثہ حاصل کرنے والا جانتا ہے کہ میں نے اپنے مال کو تلف نہیں کرنا بلکہ اسے قومی کاموں پر صرف کرنا اور اسے پہلے سے بھی زیادہ بڑھانا ہے

تا کہ قوم کا قدم ترقی کی طرف بڑھے تنزل کی طرف نہ جھکے اور اگر کسی کے پاس مال ہے تو اس سے محبت نہیں رکھتا۔ چندے کے وقت سارے کا سارا مال لے آتا ہے اور پھر اس بات کی احتیاط رکھتا ہے کہ اس کے مال میں کوئی حرام پیسہ نہ آ جائے جب ترقی کی تمام علامات محمدؐرسول اللہ اور آپ کے ساتھیوں میں پائی جاتی ہیں اور تنزل کی تمام علامات تم میں موجود ہیں تو تمہیں یہ خیال ہی کس طرح کر سکتے ہو کہ تم غالب آ جاؤگے اور مسلمان مغلوب ہو جائیں گے۔ بے شک تعداد کے لحاظ سے تم زیادہ ہو مگر بہت سی چڑیاں باز پر فتح حاصل نہیں کر سکتیں۔ تم میں سے ہر شخص وہ ہے جو یتامیٰ کی خبر گیری نہیں کرتا اور اس لئے وہ انتہائی طور پر بزدل اور ڈرپوک ہے۔ تم میں سے ہر شخص وہ ہے جو غرباء کی اعانت نہیں کرتا اس لئے تمہیں قومی جنگوں کے وقت کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ تم میں سے ہر شخص وہ ہے جسے اپنے باپ دادے سے جب ورثہ میں روپیہ ملتا ہے تو وہ اسے عیاشی میں برباد کر دیتا ہے۔ تم میں سے ہر شخص وہ ہے جس کے دل میں مال کی انتہائی محبت پائی جاتی ہے اور اس وجہ سے جب قوم کے لئے مال کی ضرورت ہو تم میں سے کوئی شخص روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ جب تمہاری یہ حالت ہے اور مسلمانوں کی وہ حالت تو یہ لازمی بات ہے کہ مسلمان جیتیں گے اور تم ہارو گے۔

یہی چیز ہے جو ہماری جماعت کے افراد کو اپنے مدنظر رکھنی چاہیئے۔ اگر ہماری جماعت ترقی کرنا چاہتی ہے تو ضروری ہے کہ وہ یہ چار باتیں اپنے اندر پیدا کرلے اور پوری مضبوطی کے ساتھ ان پر قائم رہے۔ اگر ہمارے مبلغ اور ہمارے معلّم اور ہمارے صدر اس بات کو مدنظر رکھیں کہ ہم نے یتامیٰ کی خبر گیری کرنی ہے ہم نے ان کو صرف کھانا ہی نہیں کھلانا بلکہ ان کا اکرام کرنا ہے، اگر وہ سمجھیں کہ ہم نے مساکین کو کھانا پینے کے لحاظ

سے ہر قسم کی تکالیف سے محفوظ رکھنا ہے، اگر وہ خیال رکھیں کہ ہم نے لوگوں میں کام کرنے کی عادت پیدا کرنی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم میں سے کوئی شخص اپنے باپ دادا کی جائیداد لے کر بیٹھ جائے اور خود کام نہ کرے اگر ایک شخص کروڑ پتی بھی ہے مگر وہ صرف اپنے باپ دادا کی جائیداد پر بیٹھا ہوا ہے خود کوئی کام نہیں کرتا تو قوم کو اس کی ذرا بھی عزت نہیں کرنی چاہیۓ اس کے متعلق یہ نہیں کہنا چاہیۓ کہ وہ بڑا رئیس ہے بلکہ اسے چوہڑوں اور چماروں سے بھی زیادہ ذلیل اور بد تر سمجھنا چاہیۓ۔ اسی طرح قوم میں کوئی شخص ایسا ہو جو مال سے محبت رکھتا ہو تو جماعت کو سمجھ لینا چاہیۓ کہ یہ وہ شخص ہے جو کسی وقت ہمارے لئے غدّار ثابت ہو گا اور جب بھی اسے موقع ملے گا روپیہ کے ڈر کے مارے دشمن سے مل جائے گا۔ اگر یہ چار باتیں تم اپنے اندر پیدا کر لو تو چاہے تمہارے دشمن لاکھ ہوں، کروڑ ہوں، دس کروڑ ہو وہ کروڑ یا دس کروڑ چڑیاں ہوں گی اور تم ان کے مقابلہ میں باز ہو گے۔“

(تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ566 تا 574، پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

(روزنامہ الفضل آن لائن ایڈیشن مطبوعہ 25 اکتوبر 2022ء لندن)

قسط 8

تفسیر کبیر میں اجتماعی منہج کی چند مثالیں

”زکوٰۃ کی ضرورت اوراس کی اہمیت درحقیقت غربت کے سوال سے پیداہوتی ہے اور غربت ایک ایسی چیز ہے جو کبھی بھی بنی نوع انسان سے جدانہیں ہوئی۔ عام طور پر لوگ خیال کرلیتے ہیں کہ جب دنیا کی آبادی بڑھ جاتی ہے تو ایک حصہ غریب ہوجاتاہے۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ آبادی کی کمی کی صورت میں بھی ہمیں غربت ویسی ہی نظر آتی ہے جیسے اس کی کثرت کی صورت میں۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کے زمانہ میں باوجود اس کے کہ اس وقت صرف چند ہی افراد تھے قرآن کریم سے معلوم ہوتاہے کہ ان میں سے بھی بعض پر غربت کا زمانہ آیا تھا کیونکہ فرماتاہے کہ اگر تواس جنت میں رہے گا تو تو پیاسا نہیں رہے گا۔ تیرے ساتھی بھوکے نہیں رہیں گے اور تیرے ساتھی ننگے نہیں رہیں گے۔ اس وسیع دنیا میں جہاں ہر دولت اورہر خزانہ خالی پڑاتھا اور کسی کا کوئی مالک نہیں تھا کسی مخصوص قانون میں رہ کر روزی ملنے کاسوال ہی کہاں پیداہوسکتاتھا۔ ساری دنیا کاسونا ان کے قبضہ میں تھا۔ ساری دنیا کی چاندی ان کے قبضہ میں تھی۔ ساری دنیا کا پیتل ان کے قبضہ میں تھا۔ ساری دنیا کالوہا ان کے قبضہ میں تھا۔ ساری دنیا کے پھل،پھول اوراعلیٰ درجہ کی زمینیں ان کے قبضہ میں تھیں۔ پھر یہ سوال کیونکر پیداہوا کہ اگر تو ایک خاص قانون کے ماتحت رہے گا تو بھوک اور ننگ سے بچ جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ باوجود ساری دولتوں کے پھر بھی اس بات کا امکان تھا کہ بعض لوگ بھوکے رہیں۔ بعض پیاسے رہیں اور بعض ننگے رہیں اور یہ صحیح بات ہے۔ درحقیقت دنیا میں دولت دوقسم کی ہوتی ہے ایک بالقوۃ اور ایک بالفعل۔ پھر بالفعل بھی دوقسم کی ہوتی ہے۔ ایک بالفعل دولت ایسی ہوتی ہے جوسکہ کی

صورت میں ہویاان چیزوں کی صورت میں جن سے دوسری اشیاء خریدی جاسکتی ہیں اور ایک بالفعل دولت اجناس کی صورت میں ہوتی ہے جن کو استعمال کیاجاتاہے۔ پھر اجناس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بغیر کسی اور تیاری کے انسان کے استعمال میں آجاتی ہیں اورایک وہ جن کی تیاری کے لئے کوشش اور سعی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں تک بالقوۃ دولت یعنی وجود دولت کاسوال ہے انگریزوں نے اس کانام ویلتھ رکھا ہے اور اس سے مراد کسی ملک کے وہ سامان دولت ہوتے ہیں جو اس میں قدرتی طورپرپائے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی ملک میں سونے کی کانیں ہیں یاچاندی کی کانیں ہیں تواس کے معنے یہ ہیں کہ اس کے پاس ویلتھ ہے۔ مگراس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ اس کے پاس روپیہ ہے۔ اگروہ چاندی اس تک نہیں پہنچ سکی یالوگوں کے پاس زرخیز زمینوں میں گندم اور روئی بونے کے سامان نہیں توپھر بھی وہ لوگ بھوکے اورپیاسے اورننگے رہیں گے۔ پس ایک دولت تواس قسم کی ہوتی ہے جوبالقوۃ ہوتی ہے۔ اگراس ملک کے لوگوں میں صنعت و حرفت نہیں یاانہیں زمینداری کاعلم نہیں توباوجود اس کے کہ وہ کانوں پر بیٹھے ہوں گے اور کروڑوں کروڑ روپیہ کاسونا ان میں موجود ہوگا۔ وہ زرخیز زمینوں پر بیٹھے ہوں گے۔ ایسی زمینوں پر کہ اگر اس میں ایک دانہ بھی ڈال دیاجائے توسینکڑوں دانے پیدا ہوں۔ لیکن پھر بھی وہ فاقے مررہے ہوں گے۔ گویا ان کے پاس دولت تو ہوگی لیکن ساکن دولت ہوگی۔ لیکن اگر دنیا میں کوئی ایسانظام قائم ہوجاتاہے جولوگوں کو مختلف قسم کے فنون سکھاتاہے خواہ الہام کے ذریعہ سے یاالقائے الٰہی کے ذریعہ سے اور وہ کہتاہے کہ آؤ! ہم تمہیں زمینداری کاطریق بتاتے ہیں کپڑابننے کے طریق سکھاتے ہیں یااسی قسم کے اورفنون سکھاتے ہیں جن سے تم اپنی تمدنی حالت کو سدھار سکوتویقیناً اس کے ذریعہ لوگوں کی بھوک اوران کی پیاس دورہوجائے گی۔ جیسے اسلام کی روایتوں میں خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں یہ آتا ہے

کہ حضرت آدمؑ نے لوگوں کوزراعت سکھائی اور حضرت شیثؑ نے ان کو کپڑابنناسکھایا۔ اب چاہے انہیں آدمؑ نے سکھایاہو یا شیثؑ نے یا کسی اور نے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابتدائی زمانہ میں اس قسم کے امور میں الہام الٰہی مدد کرتاتھا۔ جیسے قرآن کریم میں صاف طورپر یہ ذکر آتاہے کہ زبان ابتداء میں الہاماً سکھائی گئی تھی۔ چنانچہ فرماتاہے عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا اس سے قیاس کرکے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جس طرح ابتدائی زمانہ میں الہام کے ذریعہ زبان سکھایاجانا ضروری تھا۔ اسی طرح الہام کے ذریعہ انہیں فنون سکھائے جانے بھی ضروری تھے۔ ورنہ اس کے بغیرانسان مدتوں تک تکلیف اٹھاتا چلاجاتا۔ پس اگر کوئی نبی آجائے اوروہ یہ کہے کہ تم زمین میں ہل چلاؤ اور کھیتی باڑی کرو۔ اسی طرح وہ مختلف قسم کے درخت اورباغات لگانے کی تعلیم دے تویقیناً اس کے نتیجہ میں اس کے ماننے والوں کو روٹی ملنے لگ جائے گی اوروہ لوگ جو نبی کے تابع نہیں ہوں گے اگر وہ زبان سیکھنے سے انکار کردیں گے توگونگے رہیں گے اور اگر کھیتی باڑی نہیں کریں گے یا کپڑا بننانہیں سیکھیں گے یا کنوئیں نہیں کھودیں گے توبھوکے اورپیاسے اورننگے رہیں گے۔ یہ فنون ابتدائی دور میں خواہ کیسی ہی ابتدائی شکل میں ہوں۔ خواہ کھال سے وہ اپنا ننگ ڈھانکتے ہوں یاپھلوں پران کا گزارہ ہوتاہواس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو لوگ اس نظام کے ماتحت آجائیں گے وہ بھوک اورپیاس اور ننگ سے بچ جائیں گے۔ لیکن باوجود اس کے پھر بھی ایک طبقہ ایسا رہ جاتاہے جو غریب ہو۔ کیونکہ حوادث آتے ہیں اورانسان کو بے دست و پابنا دیتے ہیں۔ فرض کرو۔ دنیا کے پردہ پر ایک ہی انسان ہے کشمیر بھی اس کے قبضہ میں ہے۔ ہزارہ بھی اس کے قبضہ میں ہے۔ کابل کی وادیاں بھی اس کے قبضہ میں ہیں اوراس طرح دنیا کے سارے انگور، ساری ناشپاتیاں، سارے سیب اورسارے آم اس کے قبضہ میں ہیں۔ لیکن اس کے ہاتھ بھی کٹے ہوئے ہیں اورپیر بھی کٹے ہوئے ہیں تووہ اس ساری دولت سے

فائدہ نہیں اٹھاسکے گا اور پھر بھی بھوکا اور پیاسا رہے گا۔ پس ابتدائی زمانہ میں باوجود کہ دولت موجود تھی دنیا اس سے فائدہ نہیں اٹھاسکتی تھی کیونکہ اسے فنون نہیں آتے تھے۔ جب آدمؑ کے ذریعہ دنیا نے فنون سیکھے اوران کی بھوک اور پیاس اور لباس کی دقّت دور ہوئی تو پھر بھی ایک طبقہ ایسا رہ گیا جو ان چیزوں سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھاسکتاتھا۔ جیسے لولے، لنگڑے اور اپاہج وغیرہ۔ اب چاہے ساری دنیا میں صرف پندرہ آدمی ہوں اوردولولے ہوں پھر بھی دولولے اپنی بھوک اور پیاس کیسے دور کرسکتے ہیں جب تک ان پندرہ میں کوئی نظام موجود نہ ہو اوروہ ان لولوں لنگڑوں کی بھوک اور پیاس دور کرنے کاذمہ وار نہ ہو۔ آدمؑ کی نبوت کی بنیاد اصل میں ان ابتدائی تعلیموں پر ہی تھی جن سے انسان انسان بنا۔ آپ نے بنی نوع انسان کو زبان سکھائی۔ مختلف قسم کے فنون کی تعلیم دی۔ تمدن کے اصول بتائے۔ انہیں بتایا کہ آپس میں مل کررہناچاہیئے اوراگر کوئی غریب یالولا لنگڑا ہو تواس کی مدد کرنی چاہیئے۔ جب اس قسم کی سوسائٹی قائم ہوجائے گی توہم کہہ سکیں گے کہ یہ سوسائٹی نہ بھوکی رہے گی نہ ننگی اورنہ پیاسی۔ اگر کوئی لولالنگڑاہو گاتودوسرے لوگ اس کی مدد کریں گے اور اگرلوگ بھوکے ہوں گے تو وہ زراعت اور باغبانی اور کان کنی کے ذریعہ اپنی اس تکلیف کودور کرسکیں گے اور اس طرح دنیا کو روپیہ بھی مل جائے گا اور ان کی تکالیف بھی دور ہوجائیں گی۔ پس غربت کامسئلہ اس زمانہ کی پیداوار نہیں بلکہ جب سے انسان اس دنیا میں پیدا ہوا ہے اس وقت سے یہ سوال زیر بحث چلا آیا ہے۔ جب ساری دنیا کے مالک صرف دوچار گھرانے تھے تب بھی غربت موجود تھی اور تب بھی ایک قانون کی ضرورت تھی اسی لئے حضرت آدمؑ کے ذریعہ بنی نوع انسان کو یہ پیغام دیا گیا کہ اگرتم ان قواعد کی پابندی کرو گے توبھوکے اور پیاسے نہیں رہو گے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ آدمؑ کے زمانہ میں بھی جب صرف چند آدمی تھے ممکن تھا کہ لوگ بھوکے رہیں۔ ممکن تھا

کہ وہ پیاسے رہیں اور ممکن تھا کہ وہ ننگے پھریں۔ پھر لوگ بڑھنے شروع ہوئے۔ پندرہ سے بیس اور بیس سے سوسوسے ہزار۔ ہزار سے دس ہزار اور دس ہزار سے لاکھ تک تعداد جاپہنچی اوربڑھتے بڑھتے اب تو دواڑھائی ارب تک آبادی پہنچ چکی ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے بتایا ہے پندرہ آدمیوں کی صورت میں بھی دنیا بھوکی اور ننگی رہ سکتی تھی۔ سو آدمیوں کی صورت میں بھی دنیا بھوکی اور ننگی رہ سکتی تھی۔ ہزار اور لاکھ آدمیوں کی صورت میں بھی دنیا بھوکی اور ننگی رہ سکتی تھی۔ بھوک اور ننگ کی بنیاد ویلتھ پر نہیں ہوتی یہ ایک غلط خیال ہے جو لوگوں میں پیداہو گیاہے کہ غربت آبادی کی کثرت کی وجہ سے پیداہوتی ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ غربت اورامارت کادارو مدار اس امر پر ہے کہ قانون قدرت نے زمین میں جو خزانے مخفی رکھے ہیں انسان ان کو کس حد تک استعمال کرتاہے اور کس حد تک ان کے استعمال کرنے کی عقل اور سمجھ رکھتاہے۔ مثلاً اگر سونا ہواورغلہ نہ ہوتو محض سونے سے لوگوں کی بھوک دور نہیں ہوسکے گی یااگر غلہ بھی آجائے مگرروٹی پکانی نہیں آتی توپھر بھی انسان بھوکا رہے گا۔ ایسی صورت میں ضروری ہوگا کہ کچھ مددگار ہوں کچھ لوگ کمانے والے ہوں اور کچھ لوگ پکانے والے ہوں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ غرض کئی قدم ہوتے ہیں جب تک وہ سارے کے سارے مہیانہ ہوں انسان بھوک اور ننگ سے بچ نہیں سکتا۔ یہ دور ابتدائے عالم سے چلتا آیا ہے۔ ایک زمانہ ایساتھا جب بنی نوع انسان کے پاس ذرائع آمد زیادہ ہوتے تھے اور کم حصہ مجبوریوں میں مبتلا ہوتاتھا۔ مثلاً اگر ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے لوگوں کو دیکھا جائے یاان لوگوں کی تعداد معلوم کی جائے جو بڑھاپے اور بیماریوں کی وجہ سے کسی کام کے قابل نہیں رہتے وہ کتنے ہوں گے۔ میں سمجھتاہوں کہ وہ ایک دوفیصدی سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ لیکن کام نہ ملنے کی وجہ سے ہزار میں سے نوسو بھی بیکارہوسکتے ہیں۔ جب کسی ملک کی آبادی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن

ذرائع آمد ترقی نہیں کرتے تو دس میں سے بعض دفعہ نو بیکار پھرتے ہیں۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ معذو رہوتے ہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں کام نہیں ملتا۔ پس جب دنیا کی آبادی بڑھ گئی۔ تو یہ سوال نہ رہا کہ زمین میں سے دولت کس طرح نکالی جائے بلکہ اس سوال کی صورت بالکل بدل گئی کیونکہ بعض لوگ ایسے تھے کہ باوجود اپنا سارا زور صرف کرنے کے کام سے محروم رہتے تھے۔ ایسی حالت میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ نئے کام نکالے جائیں۔ غرض یہ دور اسی طرح چلتے چلے آئے ہیں اوردنیا نے فقر و فاقہ کی تکالیف دور کرنے کے لئے مختلف قسم کی تدابیر اختیار کیں۔ چنانچہ کبھی ایسا دور آیا کہ لوگوں نے یہ فیصلہ کردیا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندہ رہنے کے قابل ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوتے۔ جیسے ہندوستان میں شودروں کی کثرت تھی مگر برہمنوں اور کھشتریوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ ان لوگوں کا کوئی حق نہیں کہ دنیا میں زندہ رہیں۔ یہ اگر مرتے ہیں تو بیشک مریں۔ چنانچہ انہوں نے لوٹ مار شروع کردی اورشودروں کا کوئی حق متمدن زندگی میں تسلیم نہ کیا گیا۔ پھر بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ اس مصیبت کا علاج صدقہ و خیرات ہے۔ جن کے پاس زیادہ مال ہو انہیں چاہیئے کہ وہ غرباء کی مدد کردیا کریں۔

غرض مختلف تدابیر اپنے اپنے رنگ میں اختیار کی گئیں۔ مگر کوئی بھی تدبیر ایسی کامل نہیں تھی جس سے اس مصیبت کو کلیتہً دور کیا جاسکتا۔ اسلام ہی تھا جس نے اس سوال کا صحیح معنوں میں حل کیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اس قسم کا صدقہ کوئی چیز نہیں ایک معین اور منظم صورت میں غرباء کی بہبودی کا انتظام ہوناچاہیئے چنانچہ اس کے لئے اس نے زکوۃ اور عشر کا طریق جاری کیا۔ جس میں امراء سے باقاعدہ ایک نظام کے ماتحت روپیہ لیا جاتااورغرباء

کی ضروریات پر صرف کیاجاتا۔ پھر اس نے خبر گیری کے طریق بھی معین کردیئے۔ یوں تو پہلے بھی حکومتیں ٹیکس لیا کرتی تھیں مگر ان کا خرچ معین نہیں تھا۔

اسلام نے اول آمد پر ایک مقرر حصہ ادا کرنا واجب کردیا اور اس امر کا فیصلہ کیا کہ امراء سے بہر حال اتنا روپیہ لے لیاجائے۔ دوسری طرف اس نے خرچ بھی معیّن کردیا اور اس طرح غرباء کے گزارہ کی صورت پیدا کر دی۔ آمد اور خرچ سے تعلق رکھنے والے یہ دو نقطے ایسے ہیں جو اسلام سے پہلے اور کسی قوم میں نہیں پائے جاتے تھے زکوۃ یہودیوں میں بھی ہے مگر ناقص صورت میں۔ (دیکھو خروج باب 23 آیت 10 - 11)

لیکن اسلام نے اس قانون کو مدون کرکے ایک ایسا عظیم الشان نظام قائم فرمایا جو ہمارے لئے ہر تاریکی کی گھڑی میں شمع ہدایت کا کام دیتاہے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اس نظام کی پوری اہمیت نہ سمجھی اور لدھیانے کے بڈھے دریا کی طرح یہ نظام بھی ریت میں غائب ہو گیا اور مسلمان اس سے کلیۃً غافل ہوگئے۔ حالانکہ رسول کریمؐ نے مدینہ میں آکر پہلا کام ہی یہ کیا تھا کہ جائیدادوالوں کو بے جائیداد والوں کا بھائی بنادیا۔ انصارؓ جائیدادوں کے مالک تھے اور مہاجرؓ بے جائیداد تھے۔ رسول کریمؐ نے انصارؓ اور مہاجرینؓ دونوں میں مواخات قائم فرمادی اور ایک ایک جائیداد والے کو ایک ایک بے جائیداد والے سے ملادیا اوراس میں بعض لوگوں نے اتنا غلّو کیا کہ دولت تو الگ رہی بعض کی اگر دو بیویاں تھیں توانھوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کی خدمت میں یہ پیشکش کی کہ وہ ان کی خاطر اپنی ایک بیوی کو طلاق دینے کے لئے تیار ہیں۔ وہ ان سے بے شک شادی کرلیں۔ یہ مساوات کی پہلی مثال تھی جو رسول کریمؐ نے مدینہ میں جاتے ہی قائم فرمائی۔ کیونکہ حکومت کی بنیاد دراصل مدینہ میں ہی پڑی تھی۔ اس زمانہ میں زیادہ دولتیں نہ تھیں یہی

صورت تھی کہ امیر اورغریب کو اس طرح ملا دیاجائے کہ ہر شخص کو کھانے کے لئے کوئی چیز مل سکے۔ پھر ایک جنگ کے موقعہ پر بھی رسول کریمؐ نے اس طریق کو استعمال فرمایا۔ گواس کی شکل بدل دی۔ ایک جنگ کے موقعہ پر آپ کو معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں رہی یا اگر ہے تو بہت ہی کم اور بعض کے پاس کافی چیزیں ہیں۔ تو یہ صورت حالات دیکھ کر رسول کریمؐ نے فرمایا کہ جس جس کے پاس جو کوئی چیز ہے وہ لے آئے اور ایک جگہ جمع کردی جائے۔ چنانچہ سب چیزیں لائی گئیں اور آپ نے راشن مقرر کردیا۔ گویایہاں بھی وہی طریق آ گیا کہ سب کو کھانا ملناچاہیئے۔ جب تک ممکن تھا سب لوگ الگ الگ کھاتے رہے مگر جب یہ امر ناممکن ہو گیا اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ بعض لوگ بھوکے رہنے لگ جائیں گے تو رسول کریمؐ نے فرمایا کہ اب تمہیں علیحدہ کھانے کی اجازت نہیں اب سب کوایک جگہ سے برابر کھانا ملے گا۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ کے اس حکم پر ہم نے اس سختی سے عمل کیا کہ اگر ہمارے پاس ایک کھجور بھی ہوتی تو ہم اس کا کھانا سخت بددیانتی سمجھتے تھے اوراس وقت تک چین نہیں لیتے تھے جب تک کہ اس کو سٹور میں داخل نہیں کردیتے تھے۔ یہ دوسرانمونہ تھا جو رسول کریمؐ نے دکھایا۔ پھر رسول کریمؐ کے زمانہ میں دولت بھی آئی اورخزانوں کے منہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیئے۔ مگراللہ تعالیٰ چاہتاتھا کہ اس بارہ میں تفصیلی نظام رسول کریمؐ کے بعد جاری ہو تالوگ یہ نہ کہہ دیں کہ یہ صرف رسول کریمؐ کی خصوصیت تھی۔ کوئی اور شخص اسے جاری نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ادھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ سے ایک نمونہ قائم کردیا اورادھر مدینہ پہنچتے ہی انصارؓ نے اپنی دولتیں مہاجرین کے سامنے پیش کردیں۔ مہاجرین نے کہا ہم یہ زمینیں مفت میں لینے کے لئے تیار نہیں ہم ان زمینوں پر بطور مزارع کام کریں گے اور تمہاراحصہ تمہیں دیں گے۔ لیکن یہ مہاجرین کی طرف سے اپنی ایک

خواہش کا اظہار تھا۔ انصارؓ نے اپنی جائیدادوں کے دینے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گورنمنٹ راشن دے تو کوئی شخص نہ لے۔ اس سے گورنمنٹ زیر الزام نہیں آئے گی۔ یہی کہاجائے گا کہ گورنمنٹ نے توراشن مقرر کردیا تھا۔ اب دوسرے شخص کی مرضی تھی کہ وہ چاہے لیتایا نہ لیتا۔ اسی طرح انصارؓ نے سب کچھ دے دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ مہاجرینؓ نے نہ لیا۔ غرض عملی طور پر رسول کریمؐ نے یہ کام اپنی زندگی میں ہی شروع فرمادیا تھا۔ یہاں تک کہ جب بحرین کا بادشاہ مسلمان ہوا توآپ نے اسے ہدایت فرمائی کہ تمہارے ملک میں جن لوگوں کے پاس گزارہ کے لئے کوئی زمین نہیں ہے تم ان میں سے ہر شخص کو چار درہم اورلباس گزارہ کے لئے دو تاکہ وہ بھوکے اور ننگے نہ رہیں۔ (سیرۃ النبویہ بر حاشیہ السیرۃ الحلبیہ جلد3 صفحہ69) اس کے بعد مسلمانوں کے پاس دولتیں آنی شروع ہو گئیں۔ چونکہ مسلمان کم تھے اوردولت زیادہ تھی اس لئے کسی نئے قانون کے استعمال کی اس وقت ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ کیونکہ جو غرض تھی وہ پوری ہورہی تھی۔ اصول یہ ہے کہ جب خطرہ ہو تب قانون جاری کیا جائے اور جب نہ ہواس وقت اجازت ہے کہ حکومت اس قانون کو جاری کرے یا نہ کرے۔ جب رسول کریمؐ وفات پاگئے اور مسلمان دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلنے شروع ہوئے تو اس وقت غیر قومیں بھی اسلام میں شامل ہو گئیں۔ عرب لوگ توایک جتھہ اور ایک قوم کی شکل میں تھے اوروہ آپس میں مساوات بھی قائم رکھتے تھے جب اسلام مختلف گوشوں میں پہنچا اور مختلف قومیں اسلام میں داخل ہونی شروع ہوئیں توان کے لئے روٹی کاانتظام بڑا مشکل ہو گیا۔ آخر حضرت عمرؓ نے تمام لوگوں کی مردم شماری کرائی اورراشننگ سسٹم قائم کردیا۔ جوبنو امیہ کے عہد تک جاری رہا۔ یورپین مؤرخ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے پہلی مردم شماری حضرت عمرؓ نے کرائی تھی اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ سب سے

پہلی مردم شماری رعایا سے دولت چھیننے کے لئے نہیں بلکہ ان کی غذا کا انتظام کرنے کے لئے جاری کی تھی اور حکومتیں تو اس لئے مردم شماری کراتی ہیں کہ لوگ قربانی کے بکرے بنیں اور فوجی خدمات بجالائیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس لئے مردم شماری نہیں کرائی کہ لوگ قربانی کے بکرے بنیں بلکہ اس لئے کرائی کہ ان کے پیٹ میں روٹی ڈالی جائے۔ چنانچہ مردم شماری کے بعد تمام لوگوں کو ایک مقررہ نظام کے ماتحت غذا ملتی اور جو باقی ضروریات رہ جاتیں ان کے لئے انہیں ماہوار کچھ رقم دے دی جاتی اور اس بارہ میں اتنی احتیاط سے کام لیا جاتا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب شام فتح ہوا اور وہاں سے زیتون کا تیل آیا تو آپ نے ایک دفعہ لوگوں سے کہا کہ زیتون کے استعمال سے میرا پیٹ پھول جاتا ہے۔ تم مجھے اجازت دو تو میں بیت المال سے اتنی ہی قیمت کا گھی لے لیا کروں۔ (سیرۃ ابن عمر الخطاب لابن الجوزی صفحہ 93) غرض یہ پہلا قدم تھا جو اسلام میں لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اٹھایا گیا اور ظاہر ہے کہ اگر یہ نظام قائم ہو جائے تو اس کے بعد کسی اور نظام کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ سارے ملک کی ضروریات کی ذمہ دار حکومت ہو گی۔ ان کا کھانا، ان کا پینا، ان کا پہننا، ان کی تعلیم، ان کی بیماریوں کا علاج اور ان کی رہائش کے لئے مکانات کی تعمیر یہ سب کا سب اسلامی حکومت کے ذمہ ہو گا اور اگر یہ ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ تو کسی بیمہ وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر بدقسمتی سے بعد میں آنے والوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بادشاہ کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو کچھ دے دے اور چاہے تو نہ دے اور چونکہ اسلامی تعلیم ابھی پورے طور پر راسخ نہیں ہوئی تھی وہ لوگ پھر قیصرو کسریٰ کے طریق کی طرف مائل ہوگئے۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ بڈھا دریا جو ریت میں غائب ہو چکا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے پھر میرے دل میں از سر نو جاری کیا۔ میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے قرآن کریم کی یہ تعلیم لوگوں کے سامنے

رکھی۔ مسلمان مجھ سے کثرت کے ساتھ پوچھا کرتے ہیں۔ کالجوں کے پروفیسر اور طلباء بھی یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ اگراسلامی تعلیم یہی تھی تو پھر یہ غائب کیوں ہو گئی؟ اورمیں ہمیشہ انہیں کہا کرتاہوں کہ اس تعلیم کا غائب ہوناہی بتاتاہے کہ یہ الٰہی تعلیم تھی۔ اگر یہ انسانی تعلیم ہوتی تو لوگوں کے دلوں میں ضرور قائم رہتی۔ کیونکہ انسانی تعلیم کو قبول کرنے کے لئے لوگوں کے دماغ تیار ہوچکے ہوتے ہیں اورماحول مناسب ہوتاہے۔ پس اس کا غائب ہونا ہی بتارہاہے کہ یہ تعلیم خدا کی طرف سے آئی تھی۔ وہ ایک دفعہ لہر کی صورت میں اٹھی اورپھر اس میں انحطاط واقع ہو گیا۔ اب مقدر یہ ہے کہ پھر دوبارہ اس کی لہر بلند ہو اور اس کی دوسری لہر پہلی سے زیادہ اونچی ہو۔ قانون قدرت پر غور کرکے دیکھ لو۔ اس میں یہی نظارہ نظر آئے گا۔ بچپن میں جب ابھی میں نے پہاڑ نہیں دیکھاتھا میں یہ خیال کیا کرتاتھا کہ پہاڑ مینار کی طرح ہوتاہو گا اوررسہ پکڑ کر اوپر چڑھنا پڑتاہو گا مگرجب میں پہلی دفعہ شملہ گیا تو میں نے دیکھا کہ پہلے ایک ٹیلہ آتا ہے اس کے بعد دوسراٹیلہ آتا ہے۔ پھر تیسراٹیلہ آتا ہے اور ہر ٹیلہ پہلے ٹیلے سے زیادہ بلندہوتاہے۔ مگرہرٹیلے کے بعد ایک انحطاط بھی ہوتاہے۔ جب انسان پہلے ٹیلے پر قدم رکھتاہے تواس کے بعد اسے یہ محسوس ہوتاہے کہ میں اب نیچے جارہاہوں۔ مگر درحقیقت وہ پہلی سطح سے اونچا ہورہاہوتاہے۔ پھر دوسرے ٹیلے کے بعد جب نیچے اترتاہے۔ توپھر اس کے دل میں یہ خیال پیداہوتاہے کہ اب میں نچلی طرف جارہاہوں مگرحقیقت میں اس کا قدم اونچا اٹھ رہاہوتاہے۔ اسی طرح قدم بقدم ارتقاع اورانحطاط کے دوروں میں سے گذرتے ہوئے وہ بہت بلند پہاڑپر چڑھ جاتاہے۔ جس طرح قانون قدرت میں ہمیں یہ نظارہ نظر آتاہے۔ اسی طرح انسانی دماغوں کا ارتقاء بھی ہے۔ جب رسول کریمؐ مبعوث ہوئے اس وقت رسول کریمؐ سے براہ راست فیوض حاصل کرنے کے نتیجہ میں یہ تعلیم لوگوں نے اپنا لی۔ مگر چونکہ دماغی ارتقاء بھی

لہروں کی صورت میں چلتاہے اس لئے پہلی لہر کے بعد اس میں ایک انحطاط کی صورت واقع ہو گئی۔ اب دوسری لہر حضرت مسیح موعودؑ کے ذریعہ بلند ہوئی ہے اور یہ لہر قانون قدرت کے مطابق پہلی لہر سے زیادہ بلند ہو گی۔ مگر بہر حال ہر لہر کے بعد ایک انحطاط بھی آتاہے اور لوگ اصل تعلیم کو بھول جاتے ہیں۔ جب تک یہ چیز قائم ہے اس وقت تک کسی انشورنس وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ انشورنس کی غرض آخر کیا ہوتی ہے۔ یہی کہ اگر ہم مر جائیں توہمارے بیوی بچوں کو روٹی ملتی رہے۔ کپڑا ملتارہے۔ سامان خوردونوش اورمکان ملتارہے۔ جب حکومت ان تمام چیزوں کی ذمہ وار ہو گی توانشورنس کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ کیونکہ ساروں کومکان بھی مل رہا ہو گا۔ غذا بھی مل رہی ہو گی۔ کپڑا بھی مل رہاہو گا۔ ان کی تعلیم کا بھی انتظام ہورہاہو گا اور ان کی بیماریوں کا علاج بھی ہورہاہو گا۔ یہی وہ قومی اخراجات ہیں جن کی ادائیگی کے لئے اسلام نے زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کا وسیع نظام جاری فرمایا ہے اور مومنوں کی علامت ہی اس نے یہ بتائی ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اس طرح مخلوق کی خدمت کرکے خالق کی محبت کوحاصل کرتے ہیں۔ دنیا میں بہترین ذریعہ کسی کی محبت حاصل کرنے کا یہی ہوتاہے کہ اس کے کسی عزیز سے محبت کی جائے ریلوے سفر میں روزانہ یہ نظارہ نظر آتاہے کہ پاس بیٹھے ہوئے دوست کے بچہ کو ذراپچکار دیں یااسے کھانے کے لئے کوئی چیز دے دیں توتھوڑی دیر کے بعد ہی اس کاباپ اس سے محبت کی باتیں کرنے لگ جاتاہے کہ گویا وہ اس کا بہت پرانا دوست ہے۔ یہی طریق روحانی دنیا میں بھی جاری ہے۔ جب انسان بنی نوع انسان کی بھوک اور ان کے افلاس کودور کرنے کے لئے اپناروپیہ خرچ کرتاہے توخداتعالیٰ کہتا ہے کہ چونکہ یہ میرے پیاروں کی خدمت کرتاہے اس لئے اسے بھی میرے پیاروں میں داخل کرلیا جائے۔ حدیثوں میں آتاہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بعض لوگوں سے کہے گا کہ

دیکھو میں بیمار تھا مگر تم لوگ میری عیادت کے لئے نہ آئے۔ میں بھوکا تھا۔ مگر تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ میں ننگا تھا۔ تم نے مجھے کپڑا نہ دیا۔ اس پر وہ بندے کہیں گے کہ اے ہمارے رب! تو کس طرح بیمار ہوسکتا تھا یا تو کس طرح بھوکا اور ننگا ہو سکتا تھا تو تو ان نقائص سے منزہ ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جب میرے بندوں میں سے بعض لوگ بیمار تھے یا بعض لوگ بھوکے اور ننگے تھے اور تم نے ان کی تیمار داری نہ کی۔ نہ انہیں روٹی کھلائی اور نہ ان کا ننگ ڈھانکنے کے لئے انہیں کپڑا دیا تو تم نے انہیں ان چیزوں سے محروم نہیں کیا بلکہ مجھے محروم کیا۔ پس زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم ترین رکن ہے جس کو نظر انداز کرنا انسان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنادیتا ہے۔ کیونکہ ایسا انسان غرباء کے حقوق کو نظر انداز کرنے والا ہوتا ہے۔

پھر فرماتا ہے: مومنوں کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ وہ آخرت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ یعنی وہ قربانیاں کرتے اور کرتے چلے جاتے ہیں اور اس امر کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ ان قربانیوں کا پھل انہیں زندگی میں بھی ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ کیونکہ وہ آنے والی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور یہ یقین ان کے اندر اتنی جرأت پیدا کردیتا ہے کہ وہ قربانیوں کی آگ میں اپنے آپ کو بلادریغ جھونک دیتے ہیں۔

دنیا میں بھی جب ایک سپاہی لڑائی میں جاتا ہے تو آخر کون سے فائدہ کے لئے جاتا ہے۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ میں مارا جاؤں گا اور بسا اوقات وہ مارا جاتا ہے مگر فائدہ اس کی قوم اٹھاتی ہے۔ اسی طرح جب ماں اپنے بچے کو اپنا خون چوسا رہی ہوتی ہے تو اسے کیا فائدہ حاصل ہورہا ہوتا ہے۔ دودھ کا ایک ایک گھونٹ ماں کے خون سے بنتا ہے۔ اس لئے ایک ایک گھونٹ جو بچے کے گلے سے اترتا ہے وہ درحقیقت ماں کا خون ہوتا ہے جسے وہ چوستا ہے۔

اگر تمہاری ماں تمہارے منہ میں اپنا دودھ نہ ڈالتی۔ اگر تمہاری ماں بھی یہی کہتی کہ میں اپنا خون کیوں چوسنے دوں تو تم زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ تمہاری ماں نے تمہیں اپنا خون دیا اس لئے کہ تم زندہ رہو۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنا خون گراؤ تاکہ تمہاری اولاد اور تمہاری قوم اور تمہارا ملک زندہ رہے۔

بدر کی جنگ میں جو صحابیؓ شہید ہوئے تھے ان صحابیوںؓ نے دنیا کا کون سا سکھ دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنے ماں باپ کو چھوڑا اوراپنے رشتہ داروں کو چھوڑا اپنے ساتھیوں کو چھوڑا اور پھر تیرہ برس تک کفار کے سخت ترین مظالم کا نشانہ بننے کے بعد ایک دکھتے ہوئے دل کے ساتھ،ایک رستے ہوئے زخم کے ساتھ انہوں نے مکہ کو بھی چھوڑ دیا اس امید کے ساتھ کہ انہیں پھر مکہ کی زیارت نصیب ہو گی۔ مگرابھی ہجرت پر ڈیڑھ سال بھی نہیں گذراتھا کہ وہ اپنے وطن سے دور۔ پرانے وطن سے بہت دور اورنئے وطن سے بھی میلوں دور ایک تپتے ہوئے ریت کے جنگل میں کفار کی تلوار سے کٹ کٹ کر تڑپنے لگ گئے۔ ان کے سر ایک طرف تھے اوردھڑ دوسری طرف۔ اگریہ لوگ بھی یہی کہتے کہ ہم نے قربانی کرکے کیا لینا ہے۔ پھل تودوسروں نے کھانا ہے تواسلام کو وہ شان و شوکت جو بعد میں اسے حاصل ہوئی کہاں حاصل ہوسکتی تھی۔

اسی طرح جنگ احد کا ایک واقعہ ہے۔ جنگ کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت ابی ابن کعبؓ کو فرمایا کہ جاؤ اور زخمیوں کو دیکھو۔ وہ دیکھتے ہوئے حضرت سعد بن ربیعؓ کے پاس پہنچے جو سخت زخمی تھے اور آخری سانس لے رہے تھے۔ انہوں نے ان سے کہا کہ اپنے متعلقین اور اعزّاء کو اگر کوئی پیغام دینا ہو تو مجھے دے دیں۔ حضرت سعدؓ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں منتظر ہی تھا کہ کوئی مسلمان ادھر آئے توپیغام دوں۔ تم میرے ہاتھ میں ہاتھ دے

کر وعدہ کرو کہ میرا پیغام ضرور پہنچادو گے اور اس کے بعد انہوں نے جو پیغام دیا وہ یہ تھا کہ میرے بھائی مسلمانوں کو میرا سلام پہنچا دینا اور میری قوم اور میرے رشتہ داروں سے کہنا کہ رسول کریمؐ ہمارے پاس خداتعالیٰ کی ایک بہترین امانت ہیں اور ہم اپنی جانوں سے اس امانت کی حفاظت کرتے رہے ہیں۔ اب ہم جاتے ہیں اور اس امانت کی حفاظت تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اس کی حفاظت میں کمزوری دکھاؤ۔ دیکھو ایسے وقت میں جب انسان سمجھتا ہو کہ میں مر رہا ہوں۔ کیا کیا خیالات اس کے دل میں آتے ہیں۔ وہ سوچتاہے میری بیوی کا کیا حال ہو گا۔ میرے بچوں کو کون پوچھے گا۔ مگراس صحابیؓ نے کوئی ایسا پیغام نہ دیا۔ صرف یہی کہا کہ ہم آنحضرتؐ کی حفاظت کرتے ہوئے اس دنیا سے جاتے ہیں تم بھی اسی راستہ سے ہمارے پیچھے آجاؤ۔ ان لوگوں کے اندریہی ایمان کی طاقت تھی جس سے انہوں نے دنیا کو تہ و بالا کردیا اور قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے۔ قیصر روم حیران تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ کسریٰ نے اپنے سپہ سالار کو لکھا کہ اگر تم ان عربوں کو بھی شکست نہیں دے سکتے توپھر واپس آجاؤ اور گھر میں چوڑیاں پہن کر بیٹھو۔ یہ گوہیں کھانے والے لوگ ہیں ان کو بھی تم نہیں روک سکتے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ تو آدمی معلوم ہی نہیں ہوتے۔ یہ تو کوئی بلا ہیں۔ یہ تلواروں اورنیزوں کے اوپر سے کودتے ہوئے آتے ہیں۔

یہ جرأت مردوں پر ہی موقوف نہیں۔ مجھے تو ایک ماں کی قربانی پر حیرت آتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب عراق میں قادسیہ کے مقام پر جنگ جاری تھی۔ تو کسریٰ میدان جنگ میں ہاتھی لایا۔ اونٹ ہاتھی سے ڈرتا ہے اس لئے وہ انہیں دیکھ کر بھاگتے تھے اور اس طرح مسلمانوں کو بہت نقصان ہوا اور بہت سے مسلمان مارے گئے۔ آخر ایک دن

مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ ہو آج ہم میدان سے ہٹیں گے نہیں۔ جب تک دشمن کو شکست نہ دے لیں۔ ایک عورت حضرت خنساء اپنے چار بیٹوں کو لے کر میدان جنگ میں آئیں اوران کو مخاطب کرکے کہنے لگیں کہ پیارے بیٹو!تمہارے باپ نے اپنی زندگی میں ساری جائیداد تباہ کردی تھی اور مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے بھائی سے کہوں کہ وہ مجھے حصہ دے۔ چنانچہ میں اس کے پاس گئی۔ اس نے میرابڑا اعزاز کیا۔ بڑی دعوت کی اورپھر اپنی جائیداد میں سے آدھی مجھے بانٹ دی۔ میں وہ لے کرچلی گئی۔ توتمہارے باپ سے میں نے کہا۔ کہ اب تو آرام سے گزارہ کرو۔ مگر اس نے پھر اسے بھی برباد کردیا اور پھر مجبور کرکے میرے بھائی کے پاس مجھے بھیجا۔ پھر میں اس کے پاس گئی۔ اس نے پھر میرا بڑا اعزازواحترام کیا اور پھر بقیہ میں سے مجھے آدھی جائیداد بانٹ دی مگر وہ بھی تمہارے باپ نے برباد کردی اور پھر مجھے مجبور کیا کہ اپنے بھائی سے جاکر حصہ لوں۔ چنانچہ میں پھر بھائی کے پاس گئی اوراس نے پھر بقیہ جائیداد بانٹ دی مگر وہ بھی تمہارے باپ نے برباد کردی اورجب تمہاراباپ مراتواس نے کوئی جائیداد نہ چھوڑی۔ میں اس وقت جوان تھی۔ تمہارے باپ کی کوئی جائیداد نہ تھی۔ پھر اپنی زندگی میں اس نے میرے ساتھ کوئی حسن سلوک بھی نہ کیا تھا اور اگر عرب کے رسم و رواج کے مطابق میں بدکار ہوجاتی تو کوئی اعتراض کی بات نہ تھی۔ مگر میں نے اپنی تمام عمر نیکی سے گذاری اب کل فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے۔ میرے تم پر بہت سے حقوق ہیں۔ کل کفر اور اسلام میں مقابلہ ہوگا اگرتم فتح حاصل کئے بغیر واپس آئے۔ تومیں خداتعالیٰ کے حضور کہوں گی کہ میں ان کو اپنا کوئی بھی حق نہیں بخشتی۔ اس طرح اس نے اپنے چاروں بیٹوں کو جنگ میں تیار کرکے بھیج دیا اور پھر گھبرا کر خود جنگل میں چلی گئی اوروہاں تنہائی میں سجدہ میں گر کر اوررورو کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنے لگی اور دعایہ کی کہ اے میرے خدا! میں نے اپنے

چاروں بیٹوں کو دین کی خاطر مرنے کے لئے بھیج دیاہے لیکن تجھ میں یہ طاقت ہے کہ ان کو زندہ واپس لے آئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ مسلمانوں کو فتح بھی ہو گئی اوراس کے چاروں بیٹے بھی زندہ واپس آگئے۔ یہ جرأت او ر بہادری ایمان بالآخرۃ ہی کا نتیجہ تھی۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا کی نجات اسلام سے وابستہ ہے اورہم خواہ مارے بھی جائیں تب بھی پرواہ نہیں کیونکہ دنیا بچ جائے گی اور اسلام کو غلبہ حاصل ہوجائے گا بیشک ایک کہنے والا کہہ سکتاہے کہ آج تواسلام کو کہیں غلبہ حاصل نہیں۔ مگراس تنزل کے زمانہ میں بھی ان لوگوں کی قربانیوں نے ہی مسلمانوں کویہ عظمت دی ہوئی ہے کہ اسلام کانام بوجہ اس کثرت کے جو مسلمانوں کوحاصل ہے دنیا کے تمام لوگ ادب کے ساتھ لینے پر مجبور ہیں۔ یہ رعب مسلمانوں کو کہاں سے حاصل ہوا؟ انہی لوگوں کی قربانیوں کے نتیجہ میں حاصل ہواہے جوبسااوقات فاقہ سے رات کوسوئے اور بسااوقات فاقہ سے ہی صبح کو اٹھے بسااوقات اگران کی پگڑی پھٹی ہوئی ہوتی تھی توانہیں پہننے کے لئے دوسری پگڑی نہیں ملتی تھی۔ جوتی پھٹی ہوئی ہوتی تھی توانہیں پہننے کے لئے دوسر ی جوتی نہیں ملتی تھی۔ یہ وہی رعب ہے جو تمہارے باپ دادا کی قربانی کے نتیجہ میں تمہیں حاصل ہوا۔ کہتے ہیں نام بڑاہوتاہے کام بڑانہیں ہوتا۔ اب کام عام طور پر مسلمانوں کے چھوٹے ہیں۔ لیکن انہیں نام ایسا حاصل ہو گیاہے کہ سب لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔

حضرت مسیح موعودؑ فرمایا کرتے تھے کہ رستم کے گھر میں ایک دفعہ چور آ گیا۔ رستم اس کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلا اور دونوں میں کشتی شروع ہو گئی چور کو یہ پتہ نہیں تھا کہ جس شخص کا وہ مقابلہ کر رہا ہے وہی رستم ہے۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی رستم کا نوکر ہے۔ آخر مقابلہ کرتے کرتے چور غالب آ گیا اور وہ سینہ پر چڑھ کر رستم کی گردن

کاٹنے لگا۔ اتنے میں رستم نے یکدم شور مچادیا کہ ”آگیا رستم۔ آگیا رستم“ اور چور یہ سنتے ہی اس کے سینہ پر سے اتر کر بھاگ گیا۔ حالانکہ اس نے رستم کو گرایا ہوا تھا۔ مگر چونکہ رستم کے نام کو ایک خاص رعب حاصل ہوچکا تھا اس لئے اس نے رستم کو تو گرالیا۔ مگر رستم کے نام کا مقابلہ نہ کرسکا اور بھاگ گیا۔ تو جولوگ قربانیاں کرنے والے ہوتے ہیں وہ دنیا میں اپنا نام چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ مرجاتے ہیں مگر ان کانام ان کی اولادوں کی حفاظت کرتاچلاجاتاہے اورپھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگلے جہان میں جوانہیں لازوال بدلہ ملے گا اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پس بِالۡاٰخِرَۃِ هُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایاہے کہ مومنوں کایہ خاصہ ہے کہ وہ قربانیوں کے میدان میں بڑھتے چلے جاتے ہیں کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر کامل یقین ہوتاہے اوروہ سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ قربانیاں ہماری قوم کو بھی عزت دیں گی اور خود ہمارے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کاموجب ہوں گی۔ گویا وہ وسیع نتائج جو آئندہ نکلنے والے ہوتے ہیں ان پر انہیں پورایقین ہوتاہے اور وہ اس مقصد کے لئے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔“

(تفسیر کبیر جلد7 صفحہ330 - 347)

(روزنامہ الفضل آن لائن ایڈیشن مطبوعہ 1 نومبر 2022ء لندن)

قسط 9

صناعت لفظی کا منہج / رجحان

اس رجحانِ تفسیر کی ذیل میں علم تفسیر کی سب سے بڑی مثال سواطع الالہام کی دی جاتی ہے۔ اس تفسیر کے بارہ میں علامہ محمد عبدالحق حقانی اپنی تفسیر کے مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں:

”سواطع الالہام جس کو بے نقط تفسیر کہتے ہیں۔ ابو الیفض فیضی کی تصنیف۔ یہ جلال الدین اکبر بادشاہِ ہند کے امراء میں سے تھا۔ تمام تفسیر میں بے نقط حروف لایا اور بڑا تکلف کیا ہے۔ ایک طرح کی عبارت آرائی ہے مگر فن تفسیر اور دیگر تحقیقات سے بالکل بے بہرہ ہے۔“

(مقدمہ تفسیر حقانی، محمد عبد الحق حقانی صفحہ نمبر 211 میر محمد کتب خانہ کراچی)

صناعت لفظی کے منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر و تراجم قرآن کریم

- سواطع الالہام لابی الفضل فیضی (1547ء تا 1595ء)
- تفسیر محمدی (پنجابی) از حافظ محمد بن بارک اللہ لکھوکے والے (1871ء)
- درِّ منظوم تفسیر منظوم قرآن کریم از قادر فاضلی (فارسی) (ولادت و وفات)
- منظوم پنجابی ترجمہ از محمد فیروز الدین (1904ء)
- درس کلام اللہ (اردو زبان میں غیر منقوط تفسیری ترجمہ قرآن) از ڈاکٹر محمد طاہر مصطفیٰ (ولادت 1961ء)

جماعت احمدیہ کا صناعت لفظی کے منہج پر مبنی تفاسیر و تراجم سے متعلق مؤقف

”ایک پادری نے مجھ پر اعتراض کیا کہ فیضی کی تفسیر اعلیٰ درجہ کی فصاحت و بلاغت میں ہے، کیونکہ ساری بے نقط لکھی ہے۔ میں نے اس کا جواب دیا کہ بے نقط لکھنا کوئی اعلیٰ درجہ کی بات نہیں، یہ ایک قسم کا تکلّف ہے اور تکلّفات میں پڑنالغو امر ہے۔ مومنوں کی شان یہ ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ (المؤمنون:4) یعنی مومن وہ ہوتے ہیں جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں اگر بے نقط ہی کو معجزہ سمجھتے ہو تو قرآن شریف میں بھی ایک بے نقط معجزہ ہے اور وہ یہ ہے لَا رَيْبَ فِيْهِ اس میں ریب کا کوئی لفظ نہیں۔ یہی اس کا معجزہ ہے لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ (حٰمٓ السّجدہ:43) اس سے بڑھ کر اور کیا خوبی ہوتی۔“

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 454-455 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

”اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ چونکہ قرآنی فصاحت بلاغت فضول طریقوں سے بکلّی پاک اور منزہ ہے۔ پس اس صورت میں حکیم مطلق کی شان مقدس سے بالکل دور تھا کہ وہ فضول گو شاعروں کی طرح بے نقط یا بانقط عبارت میں اپنا کلام نازل کرتا۔ کیونکہ یہ سب لغو حرکتیں ہیں۔ جن میں کچھ بھی فائدہ نہیں اور حکیم مطلق کی شان اس سے بلند وبرتر ہے کہ کوئی لغو حرکت اختیار کرے۔ جس صورت میں اس نے آپ ہی فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ یعنی ایماندار وہ لوگ ہیں جو لغو کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنا وقت بیہودہ کاموں میں نہیں کھوتے۔ تو پھر آپ ہی کیونکر بیہودہ کام کرتا جس حالت میں اپنی کتاب کی اس نے یہ تعریف کی ہے کہ اس کی شان میں فرمایا ہے وَالْقُرْاٰنِ

الْحَكِيْمِ۔ لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ یعنی قرآن حکمت سے پر ہے۔ باطل کو اس کے آگے پیچھے سے گزر نہیں۔ تو اس صورت میں وہ کیونکر آپ ہی باطل کو اس میں بھر دیتا۔ اس کام کے لئے تو فیضی جیسا ہی کوئی نادان فضول گو چاہئے۔ اَلْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ۔ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ خدا کے کلام کو اس طرح پر بے نقط سمجھنا چاہئے کہ وہ لغو اور جھوٹ اور بیہودہ گوئی کے نقطوں سے منزہ اور معرا ہے اور اس کی فصاحت بلاغت وہ بے بہا جوہر ہے جس سے دنیا کو فائدہ پہنچتا ہے۔ روحانی بیماروں سے شفا حاصل ہوتی ہے۔ حقائق اور دقائق کا جاننا حق کے طالبوں پر آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کا فصیح کلام معارف حقہ کو کمال اعجاز سے، کمال ترتیب سے، کمال صفائی اور خوش بیانی سے لکھتا ہے اور وہ طریق اختیار کرتا ہے جس سے دلوں پر اعلیٰ درجہ کا اثر پڑے اور تھوڑی عبارت میں وہ علوم الٰہیہ سما جائیں جن پر دنیا کی ابتدا سے کسی کتاب یا دفتر نے احاطہ نہیں کیا۔ یہی حقیقی فصاحت بلاغت ہے جو تکمیل نفس انسانی کے لئے ممد و معاون ہے جس کے ذریعہ سے حق کے طالب کمال مطلوب تک پہنچتے ہیں اور یہی وہ صنعتِ ربانی ہے جس کا انجام پذیر ہونا بجز الٰہی طاقت اور اس کے علم وسیع کے ممکن نہیں۔ خدائے تعالیٰ اپنے کلام کے ایک ایک فقرہ کی سچائی کا ذمہ وار ہے اور جو کچھ اس کی تقریر میں واقعہ ہے خواہ وہ اخبار اور آثار گذشتہ ہیں خواہ وہ آئندہ کی خبریں اور پیشگوئیاں ہیں اور خواہ وہ علمی اور دینی صداقتیں ہیں۔ وہ تمام کذب اور ہزل اور بیہودہ گوئی کے داغ سے منزہ ہیں۔"

(براہینِ احمدیہ حصہ چہارم، روحانی خزائن جلد 1 صفحہ459-466 حاشیہ در حاشیہ)

درسی اور فنّی رجحان

دنیائے عرب کی موجود یونیورسٹیز میں آجکل علم تفسیر میں علمائے متقدمین و متاخرین کی تفاسیر سے مختلف عناوین کے تحت پڑھایا جاتا ہے۔ اسی طرح برصغیر پاک و ہند میں مدارس و دینی درسگاہوں میں قدیم تفاسیر کو ہی پڑھایا جاتا تھا۔ براعظم افریقہ میں اس علم کو تنوع کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ بہر حال ذیل میں اس رجحان کی چند تفاسیر پیش کی جاتی ہیں:

- الکشاف عن حقائق التنزیل و عیون الاقاویل فی وجوہ التاویل للزمخشری (467ھ تا 538ھ)

- مدارک التنزیل و حقائق التاویل المعروف بہ تفسیر النسفی لعبداللہ بن احمد بن محمود النسفی (وفات 710ھ)

- تفسیر القرآن العظیم لابی الفداء الحافظ ابن کثیر (701ھ تا 774ھ)

- تفسیر جلالین لامام جلال الدین المحلی (791ھ تا 864ھ) امام جلال الدین السیوطی (849ھ تا 911ھ)

- انوار التنزیل و اسرار التاویل المعروف بہ تفسیر بیضاوی لناصر الدین البیضاوی (وفات 1901ء)

تفسیر کبیر اور اس کا علم تفسیر القرآن کے تدریسی ماخذ کے طور پر استعمال برصغیر پاک و ہند کےایسے ماحول میں جہاں جماعت احمدیہ اور اس کے لٹریچر پر طرح طرح کی قانونی

قدغنیں، تعصب اور نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہاں اس کتاب سے استفادہ تو کیا اس کو شائع کرنا بھی ایک بڑی بات ہے۔ تعصب کی عینک نے اس عظیم الشان اسلامی لٹریچر کو بھی دھندلا کر کے دکھایا۔ عالم عرب میں اس تفسیر کے استعمال سے متعلق کسی حتمی بات کا علم نہیں ہو سکا۔ اس کے برخلاف براعظم افریقہ کی جدید یونیورسٹیز میں اس تفسیر کو باقاعدہ تفسیری ماخذ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً مغربی افریقہ کے ملک نائیجیریا کی قابل ذکر درسگاہ، یونیورسٹی آف ابادان میں شعبہ اسلامک سٹڈیز میں علم تفسیر کی تدریس میں اس تفسیر سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی ممالک کے دینی مدارس میں بھی خواہ جماعت احمدیہ کے علم کلام کو نگاہ اعتراض سے ہی دیکھا جائے آپ کی تفسیر کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ آپ نے ایک بار فرمایا:

”میں ساری دنیا کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر اس دنیا کے پردہ پر کوئی شخص ایسا ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اُسے قرآن سکھایا گیا ہے تو میں ہر وقت اس سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میں جانتا ہوں آج دنیا کے پردہ پر سوائے میرے اور کوئی شخص نہیں جسے خدا کی طرف سے قرآن کریم کا علم عطا فرمایا گیا ہو۔ خدا نے مجھے علم قرآن بخشاہے اور اِس زمانہ میں اُس نے قرآن سکھانے کے لئے مجھے دنیا کا استاد مقرر کیا ہے۔“

(الموعود، انوارالعلوم جلد 17 صفحہ 614)

نعتی منہج/رجحان

اس منہج میں مفسر ہر آیت قرآنی سے سیرت النبی ﷺ کا کوئی نہ کوئی پہلو نکالتا ہے۔ اس

رجحانِ تفسیر کی کوئی تفسیر تو شائد عالم عرب میں نہیں ملتی۔ مگر برصغیر کے ایک عالم حاجی عبدالوہاب بخاری (المتوفیٰ 1525ء) نے اسی منہج پر ایک تفسیر لکھی۔ اس کے بارہ میں مولانا عبدالحیٔ حسنی صاحب اپنی تصنیف نزھۃ الخواطر میں لکھتے ہیں۔

"آپ (عبدالوہاب بخاری) کی ایک تفسیر ہے۔ آپ نے یہ تفسیر ماہ ربیع الثانی سن 915ھ میں لکھنا شروع کی اور 17 شوال 915ھ میں مکمل کی۔ آپ نے یہ تفسیر چھ ماہ کے عرصہ میں لکھی۔ اس تفسیر میں آپ نے اکثر بلکہ تمام آیات قرآنیہ سے مناقب نبی ﷺ ثابت کئے، آپ نے اس میں محبت رسول ﷺ کے اسرار، وجدانی کیفیات بیان کیں۔ عین ممکن ہے کہ آپ نے یہ تصنیف غلبہ حال میں لکھی کیونکہ اس میں جو آپ نے ذکر کیا اس میں سے اکثر (تاریخی اعتبار سے ثابت شدہ) درست نہیں۔"

(اعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام المعروف به نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، الجزء الرابع، صفحہ 381 مطبوعہ دار ابن حزم 1999ء)

لا منہجی یا تقصیری رجحان

اس رجحان سے متعلق ڈاکٹر عبیدالرحمن محسن اور ڈاکٹر حافظ محمد حماد اپنے تحقیقی مقالہ "برصغیر میں قرآن فہمی کے رجحانات اور اثرات" میں لکھتے ہیں۔

"عصر حاضر کے کچھ ایسے صحافی، ریٹائرڈ فوجی افسران، پروفیسرز، اداریہ نگاران اور بزعم خود دانشوران بھی "تفسیر القرآن" کا "فرض" ادا کر رہے ہیں، جن کے پاس سرے سے نہ مطلوبی اہلیت ہی موجود ہے اور نہ کوئی مخصوص منہج اور نہ وہ کسی اہل علم سے رابطہ کی

زحمت گوارا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس لا منہجی رجحان کی کوئی مستقل تفسیر تو نظر سے نہیں گزری، البتہ بعض تمدنی، قانونی اور معاشرتی مسائل میں اخبارات کے صفحات اور رسائل و جرائد میں ان کی ''نکتہ آفرینیاں'' مطالعہ سے گزرتی رہتی ہیں۔ اس طرز کے ''نکات و معارف'' کو لامنہجی تقصیری رجحان کہا جا سکتا ہے۔ ''لا منہجی'' اس لئے کہ وہ منہج سے آشنا ہی نہیں، اور ''تقصیری'' اس لئے کہ وہ آداب تفسیر اور ادوات تفسیر دونوں ہی سے قاصر اور تہی دامن ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اپنے مخصوص میدان میں کامل مہارت حاصل کرنے کے بعد وہ ''تفسیر قرآن'' میں اپنا حصہ ڈالنا بھی ''فرض'' سمجھتے ہیں اور امت کو نئے نئے ''حقائق'' سے متعارف کرواتے رہتے ہیں۔

(برصغیر میں قرآن فہمی کے رجحانات اور اثرات ڈاکٹر عبیدالرحمن محسن، ڈاکٹر حافظ محمد حماد القلم جون 2018ء صفحہ70)

''انحرافی'' یا منفرد منہج / رجحان

تفسیر کے انحرافی رجحان سے مراد وہ رجحان لیا جاتا ہے جو کہ جمہور مسلمان علماء کے رجحانات سے اختلاف رکھے۔ اس رجحان کا نام انحرافی رکھنے والوں کا اپنا تعصب اظہر من الشّمس ہے۔ بہر حال ہم اس رجحان کو منحرف کے بجائے منفرد کہہ سکتے ہیں۔ اس رجحان کے تحت جن تفاسیر کو پیش کیا جاتا ہے ان میں سے شیعہ تفاسیر ہیں۔ دوسرے نمبر پر نیچری رجحان کی حامل تفسیر، تفسیر القرآن از سر سید احمد خان (1817ء تا 1898ء) ہے۔ ایک رجحان اشتراکی رجحان ہے جس کی نمائندہ تفسیر غلام احمد پرویز (1903ء تا 1985ء) کی تفسیر ''تفسیر مطالب الفرقان'' ہے۔ اکثر علماء جماعت احمدیہ کی تفاسیر کو بھی اسی رجحان

کی ذیل میں لاتے ہیں۔ حالانکہ جماعت احمدیہ کی تفاسیر ایک الگ رجحان رکھتی ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

جماعت احمدیہ کے بانی حضرت اقدس مسیح موعودؑنے صرف جیسا کہ مذکورہ بالا علماء نے ایک مفسر کا آداب و ادوات تفسیر سے مکمل واقفیت رکھنا بتایا ہے کو معیار نہیں بنایا، بلکہ آپ نے تفسیر نویسی میں روح القدس کی تائید کو ایک بڑا ذریعہ ہدایت کا قرار دیا ہے آپ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

”تفسیر قرآن میں دخل دینا بہت نازک امر ہے۔ مبارک اور سچا دخل اس کا ہے جو روح القدس سے مدد لے کر دخل دے، ورنہ علوم مروجہ کا لکھنا دنیا داروں کی چالاکیاں ہیں۔“

(ملفوظات جلد 1 صفحہ505 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

اصلاحی منہج / رجحان

جیسا کہ پہلے کنایۃً بیان کیا جا چکا ہے کہ جماعت احمدیہ کی طرف سے پیش کی جانے والی تفاسیر کو اصلاحی تفاسیر کہنا بے جا نہیں کیونکہ جماعت احمدیہ یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعودؑدنیا کی عموماً اور امت مسلمہ کی خصوصاً اصلاح کے لئے آئے تھے۔ آپ کی اصلاحات میں ایک بڑی اصلاح فہم قرآن کی اصلاح ہے۔ آپ نے ان اسرار قرآنی سے پردہ اٹھایا جن کو غلط سمجھ کر جہاں ایک طرف مسلمان قرآنی تعلیم سے برگشتہ ہو رہے تھے وہیں علمائے مغرب اور مستشرقین اسلام پر اور قرآن حکیم پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ آپؑ آنحضرت ﷺ کی پیشگوئی کے موافق ایک حَکَم عَدل بن کر دنیا میں

تشریف لائے۔ آپ فرماتے ہیں۔

افترقت الامة، و تشاجرت الملة فمنهم حنبلي و شافعي و حنفي و مالكي و حزب المتشيّعين۔ و لا شك ان التعليم كان واحدا ولكن اختلفت الاحزاب بعد ذالك فترون كل حزب بما لديهم فرحين۔ و كل فرقة بنى لمذهبه قلعة و لا يريد أن يخرج منها و لو وجد أحسن منها صورة و كانوا لعماس اخوانهم متحصّنين۔ فارسلني الله لاستخلص الصياصي۔ واستدني القاصي، وانذر العاصي، ويرتفع الاختلاف ويكون القرآن مالك النواصي و قبلة الدين

(آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 559-560)

ترجمہ: امتِ مسلمہ افتراق و انتشار کا شکار ہو گئی ہے ان میں سے بعض حنبلی، شافعی، مالکی، حنفی اور شیعہ بن گئے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں تعلیم تو ایک ہی تھی لیکن بعد میں کئی گروہ بن گئے اور ہر گروہ اپنے نقطہ نظر پر خوش ہو گیا۔ ہر فرقہ نے اپنے اپنے مذہب کو ایک قلعہ بنا رکھا ہے اور وہ اس سے باہر نکلنا نہیں چاہتے، خواہ دوسری طرف انہیں بہتر صورتحال ملے اور وہ اپنے بھائیوں کی بے دلیل باتوں پر ڈٹ جاتے ہیں۔ پس اللہ نے اس صورتحال میں مجھے بھیجا تا کہ میں ایسے قلعوں سے انہیں باہر نکالوں اور جو دور ہو چکے ہیں انہیں نزدیک لے آؤں اور نافرمانوں کو ہوشیار کردوں اور اس طرح اختلاف رفع ہوجائے اور قرآن کریم ہی پیشانیوں کا مالک اور دین کا قبلہ بن جائے۔

ایک اور جگہ آپؑ فرماتے ہیں:

”آثار میں ہے کہ آنے والے مسیح کی ایک یہ فضیلت ہو گی کہ وہ قرآنی فہم و معارف کا صاحب ہو گا اور صرف قرآن سے استنباط کر کے لوگوں کو ان کی غلطیوں سے سے متنبہ

کرے گا جو حقائق قرآن کی ناواقفیت سے لوگوں میں پیدا ہو گئی ہوں گی۔“

(ملفوظات جلد 1 صفحہ25 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

تفسیر کبیر کا اصلاحی منہج

حضرت مصلح موعودؓ نے اپنے آقا حضرت مسیح موعودؑ سے فیض پا کر ایک عظیم الشان اصلاحی تفسیر لکھی جس میں جگہ جگہ آپ نے اسلام کی غلط سمجھ بوجھ اور مسلمان علماء کی ناکافیت کو ناصرف ظاہر کیا بلکہ ان کے تفسیری نکات کی تصحیح اور اصلاح کی۔ ذیل میں چند نمونے اس بات کے اثبات میں پیش کئے جائیں گے۔

- ”مفسرین کو یہ شوق ہوتا ہے کہ اپنی تفسیر کو دلچسپ بنائیں اس لئے وہ بعض دفعہ بے ہودہ قصے بھی اپنی تفسیروں میں درج کردیتے ہیں۔“

(تفسیر کبیر جلد ہفتم صفحہ373 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

- ”مسلمان مفسرین نے لکھا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ خسر حضرت شعیب علیہ السلام تھے جو مدین قوم کی اصلاح کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ مگر میرے نزدیک یہ درست نہیں اس لئے کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت قومِ شعیبؑ کی تباہی کے بعد ہوئی تھی جیسا کہ سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ قومِ شعیبؑ کی ہلاکت کاذکر کرنے کے بعد فرماتاہے۔ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا (اعراف:104) یعنی اس قوم کی ہلاکت کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف کھلی کھلی آیات کے ساتھ مبعوث کیا مگرانہوں

نے ظلم سے کام لیا۔ پس جبکہ قرآن کریم بوضاحت بتا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت شعیبؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ہوئی تھی تو حضرت شعیبؑ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خسر قرار دینا کس طرح درست ہوسکتاہے۔ اسی طرح قرآن کریم بتاتاہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۹۰﴾ (ھود:90) یعنی اے میری قوم! دیکھنا کہ کہیں میری دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم اپنے لئے ویسی ہی مصیبت سہیڑ لو جیسی نوحؑ یا ہودؑ یا صالحؑ کی قوم پر آئی تھی اور لوطؑ کی قوم توتم سے کچھ ایسی دور بھی نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتاہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت لوط علیہ السلام کے قریب عرصہ بعد میں ہوئے ہیں۔ پس حضرت شعیب کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں قرار دینا اور انہیں آپ کا خسر بتانا ان آیات کی روسے درست نہیں ہوسکتا۔ پس میرے نزدیک یہ صحیح نہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام ان کے خسر تھے۔"

(تفسیر کبیر جلد ہفتم صفحہ 491 – 492 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

• بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس لفظ کے کوئی معنے نہیں ہیں کیونکہ یہ عربی لفظ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں اصل میں سجّین کا نون۔ لام سے بدلہ ہوا ہے اور یہ لفظ سجل سے نکلا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (الانبیاء:105) اس صورت میں اس کے معنے تحریر کرنے کے ہیں اور یا پھر یہ لفظ سِجّیل بمعنی اَن گھڑے پتھر کے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۵﴾ (الفیل:5) لیکن یہ استدلال درست نہیں اس لئے کہ سجّین کے معانی فراء اور

زجاج اور ابوعبیدہ نے کئے ہیں اور یہ لوگ علم ادب میں بہت بلند مرتبہ رکھنے والے تھے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک لفظ عربی زبان کا نہ ہوتا اور وہ اس کے معنے کرنے لگ جاتے۔ اپنے معنوں کی تائید میں انہوں نے بعض اشعار بھی نقل کئے ہیں جن میں سجّین کا لفظ پُرانے شعراء نے استعمال کیا ہے پھر جب ہم ذاتی طور پر غور کرتے ہیں تو ہمیں عربی زبان میں اس لفظ کے اَور مادے بھی مل جاتے ہیں سَجَنَہٗ سَجْنًا کے معنے ہوتے ہیں حَبَسَہٗ فِی السِّجْنِ اس کو قید خانہ میں بند کر دیا اور سَجَنَ الْهَمَّ کے معانے ہوتے ہیں اَضْمَرَهٗ اس نے اپنے غم کو چھپا لیا۔ (اقرب) پس جب کہ اس لفظ کے دوسرے مادے عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں اور جب کہ عربی زبان کے ماہرین نے اس کے معنے دائم اور شدید کے کئے ہیں تو یہ خیال کر لینا کہ یہ لفظ عربی زبان کا نہیں ہے بلکہ کسی اَور زبان کا ہے جسے عربی زبان میں شامل کر لیا گیا ہے قطعًا غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ درحقیقت یہ ایک غلطی ہے جو بعض عرب مفسّروں کو لگی ہے۔ جب وہ ایک لفظ کو جو عام طور پر عربی میں استعمال نہیں ہوتا دیکھتے ہیں تو فوراً یہ خیال کر لیتے ہیں کہ یہ عربی کا لفظ نہیں حالانکہ دوسرے ماہرین لغت اسے عربی کا لفظ قرار دیتے ہیں۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آج کل کے عیسائی ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ قرآن کریم میں غیر زبان کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور غیر زبانوں کے الفاظ کی وجہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قرآن کریم کے متعلق جو یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ میں نازل کیا گیا ہے یہ غلط ہے حالانکہ اگر ان مفسرین کی بات جو کہتے ہیں کہ قرآن کریم کا فلاں فلاں لفظ عربی نہیں تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ اعتراض عقل کے بالکل خلاف ہے۔ دنیا کی

کوئی زبان ایسی نہیں جس میں غیر زبان کا کوئی لفظ نہ پایا جاتا ہو۔“

(تفسیر کبیر جلد ہشتم صفحہ286 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

- ”یہ آیت (آیت نسخ سورۃ البقرہ آیت 107) ایسی اہم ہے کہ میں سمجھتا ہوں اِس آیت کے متعلق جو غلط فہمی لوگوں میں پائی جاتی تھی اگر حضرت مسیح موعودؑ صرف اسی کو دُور کرتے تو میرے نزدیک یہی ایک بات آپ کی نبوت اور ماموریت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتی۔ اس کے متعلق مسلمانوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں اُن کی موجودگی میں اسلام کو سچا مذہب قرار دینا یا اُسے قلبی تسلی اور اطمینان کا موجب سمجھنانا ممکن تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں اس آیت کے معنے مسلمانوں میں یہ رائج تھے کہ ہم قرآن کریم کی جو آیت بھی منسوخ کر دیں یا اُسے بھلا دیں ہم اُس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت لے آتے ہیں۔ اس آیت کے یہ معنے کر کے وہ اِس سے قرآن کریم میں نسخ کا ثبوت نکالا کرتے تھے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرآن کریم کی بعض آیات یقیناً منسوخ ہو گئی تھیں اور منسوخ کے وہ یہ معنے لیتے تھے کہ اُن کے احکام کو معطل کر دیا گیا تھا اور بعض آیات کے متعلق وہ سمجھتے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے بُھلا دیا تھا۔ اِس نسخ کے متعلق مسلمانوں کے مختلف نظریات ہیں۔

(تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ95 پرنٹ ویل امرتسر 2010ء)

(روزنامہ الفضل آن لائن ایڈیشن مطبوعہ 8 نومبر 2022ء لندن)

قسط 10
جامع منہج یا جامع رجحان

ماضی میں مختلف تفاسیر کو ''جامع'' اور ''رجحان ساز'' تفاسیر کہا گیا ہے۔ مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی کی ''بیان القرآن'' کو جامع رجحان کی مالک تفسیر کہا گیا۔ ایسا ہی ''تفسیر مظہری'' اور ''تفسیر ماجدی'' کو بھی ''جامع'' کہا گیا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے ''ترجمان القرآن'' کو جامع کہا۔

(ابو الکلام آزاد مرتبہ عبداللہ بٹ لاہور 1943ء)

سر سید احمد خان کی ''تفسیر القرآن'' ابوالاعلیٰ مودودی کی ''تفہیم القرآن'' مفتی محمد شفیع کی ''معارف القرآن'' اور امین احسن اصلاحی کی ''تدبر القرآن'' کو رجحان ساز تفسیر قرار دیا گیا۔ (جدید تفسیری ادب: محرکات و رجحانات، (منتخب تفاسیر کا اختصاصی مطالعہ) از محمد فاروق حیدر۔ جہات الاسلام۔ جلد 9 (جولائی - دسمبر 2015ء) شمارہ:1 صفحہ 8) اور اس تفسیر کو ''عہد ساز تفسیر'' قرار دیا ہے۔

تفسیر کبیر کی 100 خوبیاں اور جامع ہونے پر دلائل

مگر ذیل میں ہم تفسیر کبیر کے جامع ہونے پر دلائل وہ نکات بیان کریں گے جن سے بخوبی ثابت ہو جائے گا کہ رجحان ساز تفسیر یا جامع رجحان کی حامل تفسیر وہی ہو سکتی ہے جو الہام الٰہی کے پانی سے سیراب ہو۔

1۔ تفسیر کبیر میں صاحب تفسیر حضرت مصلح موعودؓ ہر سورت کا ما قبل اور ما بعد کے

ساتھ تعلق و ربط بیان فرماتے ہیں۔ یہ خصوصیت باقی تفاسیر میں خال خال نظر آتی ہے۔

2۔ تفسیر کبیر میں ہر سورت کے مکی یا مدنی ہونے کے بارہ میں نا صرف گزشتہ مفسرین کے اقوال درج کئے گئے ہیں بلکہ اس ذیل میں مستشرقین کے خیالات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس بیان میں اگر آپ کو پختہ تاریخی واقعات اور عقلی دلائل کی روشنی میں اختلاف بھی کیا تو اس اختلاف کی عقلی و نقلی بنیاد بہت مضبوط ہے۔

3۔ تفسیر کبیر کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں آپ نے اپنا ترجمہ قرآن استعمال فرمایا ہے۔ اس کے بر عکس مولانا مودودی نے تفہیم قرآن میں مفہوماً ترجمہ اختیار کیا۔ مفتی محمد شفیع نے ''معارف القرآن'' میں مولانا محمود الحسن کا ترجمہ اختیار کیا ہے۔

4۔ ہر سورت کے شروع میں سورت کا جامع تعارف اور خلاصہ دیا گیا ہے۔ سورت کے نام کی وجہ اور زمانہ نزول پر بحث بھی ملتے ہے۔

5۔ تفسیر کبیر کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں ہر آیت کی تفسیر قبل چند ذوالمعارف و الوجوہ مفردات کی تفصیلی لغوی بحث دی گئی ہے۔ حل لغات میں مستعمل کل مفردات کی تعداد قریباً 3360 ہے۔ اس بحث لغوی میں اقرب الموارد، مفردات امام راغب، فقہ اللغۃ و سرّ العربیہ، المنجد، اساس البلاغہ، تاج العروس، مصباح، لسان العرب، احکام الاساس، نہایۃ بن اثیر، الصحاح، مغنی اللبیب، القاموس المحیط اور Lane وغیرہ ہیں۔

6۔ تفسیر کبیر کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں مفردات قرآنی کو سمجھنے کے لئے عربی ادب کی قدیم و جدید لغات و دیگر کتب سے شعری و نثری شواہد بھی بھی

پیش کئے گئے ہیں۔ ان کتب میں الشعر والشعراء از ابن قتیبۃ، الصاحبی از احمد بن فارس، کلیات ابن البقاء، شرح مختصر المعانی، دیوان حماسہ، درۃ الغوّاص، الاغانی لاصفہانی، المخصص لابن الفارس، مفتاح العلوم از علامہ سکاکی، زاھر لابن الانباری وغیرہ شامل ہیں۔

7۔ اسلام اور بالخصوص قرآن کریم کو اس وقت کی عرب ثقافت اور تمدن کے ساتھ سمجھنے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسا کلام جو عرب کی زبان میں اترا اس کی بہتر سمجھ ان لوگوں کے حالات، واقعات اور تاریخ کے ساتھ ہی آ سکتی ہے۔

8۔ تفسیر کبیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ قرآنی مقامات کو سمجھنے کے لئے کچھ التفات اہل کتاب اور دیگر مذاہب کی کتب مقدسہ، ان کتب کی قوامیس، ڈکشنریز، اور تفاسیر سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ان کتب میں سے کچھ عہد نامہ قدیم و جدید،شبات طالمود، ایروبین طالمود، مدراش رباہ، رگ وید، اتھر وید، دورم سندھو، ستھیارتھ پرکاش، ژند اوستا ایپو کریفا، پیکس کی تفسیر بائبل، کنسائز تفسیر بائبل، قاموس کتاب، ہارپر بائیبلز ڈکشنری از ملّر وغیرہ شامل ہیں۔

9۔ تواریخ اقوام عالم کو سمجھنے کے لئے انسائیکلوپیڈیاز کی مدد سے اور تاریخی دستاویزات کو مدنظر رکھ کر مقامات قرآنیہ کی تفسیر میں مدد حاصل کی گئی ہے۔ جن میں سے چیدہ چیدہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس،انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، انسائیکلوپیڈیا بلیکا، جیوش انسائیکلوپیڈیا،انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا، نیلسنز انسائیکلوپیڈیا وغیرہ شامل ہیں۔

10۔ تفسیر کبیر کی ایک بے نظیر خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مستشرقین کی جانب سے قرآن کریم پر اٹھنے والے اعتراضات کا کافی و شافی جواب دیا گیا ہے۔ ان مستشرقین و مغربی علماء میں پادری وھیری، راڈول، سیل اور میور وغیرہ شامل ہیں۔ یہ خصوصیت بھی عام مروجہ تفاسیر میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

11۔ تفسیر کبیر میں (بقول صاحب تفسیر حضرت مصلح موعودؓ) یورپین لوگوں کے زہریلے اثرات کا دفاع بھی موجود ہے۔

12۔ تفسیر کبیر میں جن امور میں بے پناہ زور دیا گیا ہے ان میں ہستی باری تعالیٰ کا اثبات،خالص توحید الٰہی، صفات الٰہیہ اور ان کا صحیح درک پیش بھی کیا گیا اور سمجھایا بھی گیا ہے۔

13۔ تفسیر کبیر میں سیدنا و مولانا حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سیرت و کردار، آپ کی بابرکت زندگی اور آپؐ کی زندگی کو قرآن کریم سمجھنے کے لئے ایک معیار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

14۔ تفسیر کبیر میں ناموس رسالت کی حفاظت آپؐ کی اور دوسرے پیشوایان مذاہب کی ناموس کی حفاظت سے متعلق دنیا کے سامنے چند حل رکھے گئے جن سے مذہبی رواداری پروان چڑھ سکتی ہے۔

15۔ تفسیر کبیر میں آنحضرت ﷺ کے صحابہ کی سیرت کا بھی بیان ہے اور آپ کے متعلق لوگوں میں پائی جانے والی غلط فہمیوں اور بد عقیدگی کا بھی ردّ ہے۔

16۔ تفسیر کبیر میں پیشگوئی اور اس کے متعلقات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

17۔ تفسیر کبیر میں آنحضرت ﷺ و قرآن کریم کی پیشگوئیوں کو نہایت پر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

18۔ تفسیر کبیر میں مقام نبوت کی حقیقت اور اس کی برکات و فیوض کو خاطر خواہ انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

19۔ تفسیر کبیر میں اسلام کی حقیقت، فضائل، تعلیم، نظام اور مذہب اسلام کی تعلیم کا دیگر مذاہب سے موازنہ جگہ جگہ ملتا ہے جس سے قرآن کریم ایک فرقانی قوت کے ساتھ چمکتا ہوا روشن اور تابندہ کتاب کی صورت میں نظر آتا ہے۔

20۔ تفسیر کبیر میں یہودیت، عیسائیت، ہندومت، آریہ سماج، جین مت، بدھ ازم، سکھ ازم، زرتشت ازم اور کنفیوشس ازم وغیرہ کے عقائد کا بیان اور اس میں غلطیوں کی نشاندہی اور ان کا اسلام کی تعلیم کے ساتھ موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ ان مذاہب کے علماء کی جانب سے اسلام اور قرآن کریم پر اٹھنے والے اعتراضات کے شافی جوابات دیئے گئے ہیں۔

21۔ تفسیر کبیر میں نئے مذاہب مثلاً بہائیت سے متعلق کافی و شافی مواد ملتا ہے اور اس کے عقائد باطلہ کا توڑ بھی میسر آتا ہے۔

22۔ اس تفسیر میں عالم روحانیت میں اونچی پرواز کے لئے ان تمام امور کا بیان ہے جو ایک سچی نیت والے مومن کے حصول کے لئے ضروری ہیں۔

23۔ اس تفسیر میں اخلاق فاضلہ اور ان کے حصول کی اہمیت کا ذکر ہے۔ کیونکہ اخلاق فاضلہ روحانیت میں ترقی کے لئے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

24۔ تفسیر کبیر میں عیسائیت کے ان باطل عقائد(الوہیت مسیحؑ، تثلیث وغیرہ) کاپُر زور ردّ بھی ہے جو توحید الٰہی کے خلاف ہیں اور جن کے زہر کے اثر سے برصغیر پاک و ہند، افریقہ اور دوسرے خطوں کے باشند گان متاثر ہو رہے تھے اور اسلام سے بر گشتہ ہو کر عیسائیت کی گود میں جا رہے تھے۔

25۔ تفسیر کبیر میں یہود و نصاریٰ کے اصل کتب سے عقائد کا بیان ہے اور ان کی تاریخ، فرقوں کی تفصیلات اور ان کی مذہبی رسومات کا ذکر بھی ملتا ہے۔

26۔ تفسیر کبیر میں نیکی و بدی کی اصل حقیقت، فلاسفی اور اس کی ترغیب بھی جگہ جگہ ملتی ہے۔

27۔ تفسیر کبیر میں تاریخی واقعات کا مستند ترین بیان ملتا ہے۔ اس میں کوئی بھی مسلکی کشمکش، فرقہ وارانہ تعصب یا مذہبی کھینچا تانی بھی نہیں ہے۔

28۔ تفسیر کبیر میں تواریخ اقوام عالم کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے اور اس سے نکلنے والے اسباق کی طرف بھی راہنمائی کی گئی ہے۔

29۔ تفسیر کبیر میں مذہبی آزادی، آزادی ضمیر اور شتر بے مہار آزادی کا فرق اور اس سے معاشرہ میں پڑنے والے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔

30۔ تفسیر کبیر میں ایک ریاست اور اس میں کام کرنے والی حکومت کے فرائض و حقوق، ایک اچھے معاشرہ کے قیام اور اس کی خصوصیات اور اس میں موجود سوسائٹیز کے حقوق و فرائض کو بطور احسن بیان کیا گیا ہے۔

31۔ تفسیر کبیر میں ایک سوسائٹی میں مساکین، غرباء اور یتامیٰ کی خبر گیری کرنے ان کو معاشرہ کا فعال حصہ بنانے پر خصوصی تعلیم دی گئی ہے۔

32۔ تفسیر کبیر میں جہاد سے متعلق غلط نظریات کا ردّ، اس پر اٹھنے والے اعتراضات کا جواب، اسلام کا تلوار سے پھیلنے کے عقیدہ کی تغلیط اور جہاد کی فی زمانہ ضرورت پر دلائل دیئے گئے ہیں۔

33۔ تفسیر کبیر میں الہام کی ضرورت، اہمیت اور اس کے فیضان کے جاری و ساری ہونے پر دلائل دیئے گئے ہیں۔

34۔ تفسیر کبیر میں انسان اور اس کی اخلاقی، تمدنی، روحانی حالتوں اور ان کو بہتر بنانے کی ایک تحریک ملتی ہے۔

35۔ تفسیر کبیر میں ملائکہ اور ان کی اقسام، ان کے کام اور ان سے متعلق عقائد کی تصریح اور ان سے متعلق غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے۔

36۔ تفسیر کبیر میں حیات بعد الممات، جنت و دوزخ اور بہشتی نعماء کی حقیقت کا بیان ہے جو کہ کسی اور تفسیر میں نہیں پایا جاتا۔

37۔ تفسیر کبیر میں حرام و حلال چیزوں کا بیان ان کی حرمت و حلت کی فلاسفی اور ان کے مضر یا نافع ہونے کے بارہ میں اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ موجودہ علوم و سائنس کی جدید تحقیقات سے بیان ملتا ہے۔

38۔ تفسیر کبیر میں سائنس اور مذہب کے عنوان پر تمام مختلف فیہ نظریات کو بیان کیا گیا اور اس اصل کے ساتھ دونوں میں تطابق بیان کیا گیا کہ قرآن کریم اللہ کا قول ہے اور سائنس اس کا فعل۔

39۔ تفسیر کبیر میں اصلاح قوم کے لئے قرآنی روشنی میں بہت اعلیٰ تعلیم ملتی ہے، نیز قوم کی اصلاح کو بنیاد بنا کر کئی ایک قرآنی آیات کی روشنی میں ثابت کیا گیا کہ اگر مسلم امہ آج ان ہدایات پر عمل کرے تو خیر امت کے دعوے کے ساتھ ساتھ نمونہ بھی دکھلا سکتی ہے۔

40۔ تفسیر کبیر میں عائلی اور خاندانی معاملات کی درستگی پر خاطر خواہ مواد موجود ہے۔ ایک خاندان سوسائٹی کا مائیکرو یونٹ ہوتا ہے اگر یہ درست ہو جائے تو سوسائٹی کی درستگی ایک خود کار نظام کے تحت ممکن ہے۔

41۔ تفسیر کبیر میں تربیت اولاد کو ایک خاص اہمیت دی گئی ہے۔

42۔ تفسیر کبیر میں جماعت احمدیہ کے افراد کی اصلاح، احمدی بچوں کی تعلیم وتربیت اور مسلم امہ کی فلاح و بہبود پر ایک جامع اور منظم لائحہ عمل بھی ملتا ہے۔

43۔ تفسیر کبیر میں تعلیم و تدریس کے ضوابط، اصول اور پر اثر طریقہ پر اصلاح معاشرہ کے لئے یہ تفسیر ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

44۔ تفسیر کبیر میں تحقیق اور اس کا طریقہ اور اس کے ضوابط پر بھی مفید معلومات ملتی ہیں۔

45۔ تفسیر کبیر میں تعلق باللہ، محبت رسولﷺ اور اسلام کو صحیح انداز میں سمجھ کر عمل کرنے کی طرف ایک خاص تحریک ملتی ہے۔

46۔ تفسیر کبیر میں دعا، دعا کا فلسفہ، اہمیت و برکات، طریق و قبولیت وغیرہ اور نیچری عقائد فاسدہ کا ردّ بڑی شد و مد سے کیا گیا ہے۔

47۔ تفسیر کبیر میں علوم قرآنیہ کو جاننے سمجھنے اور اس سے صحیح مفہوم اخذ کرنے کے بارہ میں قیمتی معلومات ہیں۔

48۔ تفسیر کبیر میں علم لغت، فلالوجی اور علم دلالت کی مدد سے بھی قرآنی معارف کو بیان کیا گیا ہے۔

49۔ تفسیر کبیر میں علم حدیث اور اس کے متعلقات پر عالمانہ تبصرے ہیں جن سے حدیث کا اصل منشاء سمجھ میں آ سکتا ہے۔ نیز اس کی مصطلحات اور احادیث کی مدد سے قرآن

کریم کی تفسیر سمجھنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

50۔ تفسیر کبیر میں علم فقہ و اصول فقہ پر بھی بہت اعلیٰ معلومات مل سکتی ہیں۔ اجتہاد اور اس جدید زمانہ میں بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے علم فقہ اور اجتہاد کی ضرورت پر سیر حاصل بحث ہے۔

51۔ تفسیر کبیر میں مسلمان فرقوں (سنّی و شیعہ) اور ان کے نظریات پر بھی بحث ہے ان کی غلط روشوں اور عقائد کی تصحیح بھی ملتی ہے۔

52۔ تفسیر کبیر میں علم طب، ہومیوپیتھی اور حکمت کے حوالے سے بھی قرآنی علوم پر بحث کی گئی ہے۔

53۔ اقتصادیات اور اسلامی نظام اقتصادیات کا بیان اور آجکل کے اقتصادی نظاموں کے متعلق معلومات اور ان کی غلط approach اور اس کی تصحیح بھی اس تفسیر کی ایک خصوصیت ہے۔ ان نظاموں کے بالمقابل جماعت احمدیہ کا پیش کردہ نظام، نظام وصیت کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

54۔ تفسیر کبیر میں زراعت کو فروغ دے کر انسان کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کی طرف خاص راہنمائی ملتی ہے۔

55۔ تفسیر کبیر میں غلط العام عقائد مثلاً جادو ٹونا، تعویذ گنڈے اور ان کی اصلیت کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے مقابل پر اپنا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ پختہ کرنے پر زور

دیا گیا ہے۔

56۔ تفسیر کبیر میں اہل تصوف کے بد عقائد، دین میں بدعتوں اور لا یعنی عملیات، وورد و وظائف وغیرہ کا ردّ کر کے صحابہ کے نقوش کو اپنانے کی طرف بہت توجہ دی گئی ہے۔

57۔ تفسیر کبیر میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود جیسے عقائد کا بیان اور ان کی اصلاح بھی ہے اور مقصود قرآن کو بیان کیا گیا ہے۔

58۔ تفسیر کبیر میں جنوں سے متعلق پائے جانے والے قصے کہانیوں کا ردّ کر کے اصل مدعائے قرآن کو بیان کیا گیا ہے اور نہایت اعلیٰ پیرائے میں اس کی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

59۔ تفسیر کبیر میں علوم شرعیہ کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

60۔ تفسیر کبیر میں شفاعت اور اس کے اصل معنیٰ، نیز اس سے متعلق پائے جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا گیا ہے۔

61۔ تفسیر کبیر میں نسخ فی القرآن کے مسئلہ کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور اس کے تحت ناسخ اور منسوخ آیات کا حل پیش کیا گیا ہے۔

62۔ تفسیر کبیر میں اہل تشیع کے عقائد کا بیان کر کے ان کے غلط عقائد کی اصلاح کی گئی ہے اور اہل بیت سے غلو سے پاک محبت کو ایمان کا جزو قرار دیا گیا ہے۔ نیز

ازواج مطہرات کی سیرت و کردار کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

63۔ تفسیر کبیر میں خلافت راشدہ کے دور سے متعلق درست معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ خلفائے ثلاثہ پر اٹھائے جانے والے اعتراضات کو ردّ کیا گیا ہے۔

64۔ تفسیر کبیر میں انسانی نفسیات کو سمجھ کر اس کو دعوت اسلام دینے اور سمجھانے کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔

65۔ نظام خلافت کی ضرورت، اہمیت اور اس کے ساتھ تمسّک کو فی زمانہ تمام مسائل کا حل قرار دی ہے۔

66۔ تفسیر کبیر میں مسلمانوں کے فرقوں کی باہم تکفیر بازی کو ناپسند کیا گیا ہے اور مل جل کر اپنے خیالات و نظریات کو پیش کرنے اور دلیل کے ساتھ بات کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

67۔ تفسیر کبیر میں قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کو ایک اہم موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی مدد سے کئی آیات قرآنیہ کے اچھوتے معانی پیش کئے گئے۔

68۔ تفسیر کبیر میں تفہیم قرآن کریم کو دعا کے ساتھ مشروط رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ سے بہتر تفہیم کوئی بھی عطا نہیں کر سکتا۔ یہ اصل باقی تفاسیر میں نہیں پایا جاتا۔

69۔ تفسیر کبیر میں علم رویا و کشوف سے متعلق اسرار سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔

70۔ تفسیر کبیر میں محکمات و متشابہات سے متعلق سیر حاصل گفتگو ہے ان کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔

71۔ تفسیر کبیر میں معاملات اور لین دین کے سلسلہ میں اسلامی و قرآنی تعلیمات کو خوب نکھار کر بیان کیا گیا ہے۔

72۔ تفسیر کبیر میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی ادب سے بھی خاطر خواہ استفادہ کر کے تفسیر قرآن میں شواہد کو پیش کیا گیا ہے۔

73۔ تفسیر کبیر میں پرانے مفسرین کے غلط رجحانات کو بیان کر کے ان کی اصلاح دلائل کے ساتھ کی گئی ہے۔

74۔ تفسیر کبیر میں تابعین و تبع تابعین کی خدمت اسلام کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے اور ان کے بیان کردہ معانی کو ایک خاص عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

75۔ تفسیر کبیر میں قرآن کریم کے مختلف قرأت کو بیان کر کے بھی مختلف متنوع معانی کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

76۔ تفسیر کبیر میں عصمت انبیاء کا موضوع خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مفسرین کی روایات جن سے عصمت انبیاء پر زد پڑتی ہے ان کا رد کر کے انبیاء کے شایان شان اور درست واقعات و حالات کا بیان کیا گیا ہے۔

77۔ تفسیر کبیر میں پیشگوئی، اس کی شرائط، اس کی سچائی اور پورا ہونے اور اس کے

تمام متعلقات پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔

78۔ تفسیر کبیر میں انبیاء پر پچھلی کتب کے طعن کو بیان کیا گیا اور ان انبیاء کو اس نا واجب طعن سے بچا کر اللہ کے بر گزیدہ بندے ثابت کیا گیا۔

79۔ آخری زمانوں کے متعلق پیشگوئیوں، دجال، مسیح و مہدی کی آمد اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے حوالہ سے احادیث نبویہ ﷺ اور انسانی عقل کے مطابق تفسیر کی گئی ہے۔

80۔ تفسیر کبیر میں اسلامی عبادات کی حکمت اور فلسفہ نہایت اچھوتے اور دل پذیر انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔

81۔ تفسیر کبیر میں عربی زبان کے خصائص کا کثرت سے تذکرہ کیا گیا ہے نیز اس کو ام الالسنہ ثابت کرنے کے لئے مضبوط دلائل بھی دیئے گئے ہیں۔

82۔ تفسیر کبیر میں عورت کے حقوق و فرائض، عورت کی ایک معاشرہ میں اہمیت کا جا بجا ذکر ملتا ہے۔

83۔ تفسیر کبیر میں غلاموں کے حقوق، غلامی کی مخالفت اور اس کے متعلق اسلام کی روشن تعلیم کو اس طور سے پیش کیا گیا کہ اس تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔

84۔ تفسیر کبیر میں مذہب کی اصل غرض، افادیت اور اس کی ضرورت کو آشکار کیا گیا ہے تا کہ موجود زمانہ میں مذہب کی ضرورت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی پیچید گیوں کو حل کیا سکے۔

85۔ تفسیر کبیر میں ان پیشوایان مذاہب کو جن کے مقام و مرتبہ کے بارہ میں باقی مفسرین خاموش ہیں کو نبی مانا گیا ہے۔ ان میں رام چندرجی، کنفیوشس، بدھ اور کرشنا وغیرہ شامل ہیں۔

86۔ تفسیر کبیر میں نکاح اور اس کی اہمیت، تعدد ازدواج کی تفصیلات اور اس پر اٹھنے والے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

87۔ تفسیر کبیر میں اہل تشیع کے عقائد اور ان کی تفصیلات۔ ان کی غلط روشوں کا تعین اور ان کے اعتراضات کا مکمل محاکمہ اور اعتراضات کے جوابات دیئے گئے۔ نیز مطاعن صحابہ و ازواج مطہرات، خلفائے ثلاثہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور ان مطاعن کا ردّ کیا گیا ہے۔

88۔ تفسیر کبیر میں مسلمان فرقوں کے باہمی فروق، ان کے غلط عقائد کی تصحیح اور تفرقہ پسندی کے رجحان کا خاتمہ کرنے اور تمام مسلمانوں کو عَلٰی مِلَّۃٍ وَّاحِدَۃٍ اکٹھا کرنے کے لئے ایک خاص تحریکی اسلوب نظر آتا ہے۔

89۔ تفسیر کبیر میں اسلامی تاریخ کا صحیح بیان اور ان سے ملنے والے اسباق کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

90۔ تفسیر کبیر میں اسلامی نظام و طرز حکومت میں حدود، تعزیرات اور سزاؤں کو ہر حوالہ سے عین انسانی عقل سے موافق ہونے پر بھی بہت تفصیل سے وضاحت ملتی ہے۔

91۔ تفسیر کبیر میں قرآنی قسموں کی فلاسفی کا بھی خصوصیت سے ذکر ملتا ہے۔

92۔ تفسیر کبیر میں آنحضرتﷺ کے ان معجزات و نشانات کو ثابت کیا گیا ہے اور ان پر اٹھنے والے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔

93۔ تفسیر کبیر میں صاحبِ تفسیر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کا ایک بے مثال کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے قرآن کریم کو قابل عمل کتاب کے طور پر پیش کیا، اور اس کتاب کو قیامت تک کے لئے ایک Relevant Book کے طور پر پیش فرمایا۔

94۔ تفسیر کبیر میں بیان کشوف (مثلاً حضرت حزقیل کا کشف، موسیٰؑ اور ان کے فتی سے متعلق کشف وغیرہ) کو علم تعبیر الرویا کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی اور اس طرح تفسیر کو بہت منفرد اور متنوع انداز میں پیش فرمایا۔

95۔ تفسیر کبیر میں انبیائے سابقین کی آنحضرتﷺ کے بارہ میں پیشگوئیوں کو بسط و شرح کے ساتھ اور دلائل قطعیہ کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

96۔ تفسیر کبیر میں امنِ عالم کے حوالہ سے مسلمانوں کے کردار، امن عالم کے حوالہ سے ہی اسلامی تعلیم کا دوسری سماوی تعلیمات کا موازنہ اور آپ کی مخلصانہ ترین کاوشوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

97۔ تفسیر کبیر میں ایٹامک وار فیئر اور اس سے دنیا کی ممکنہ تباہی کا خوف اور اس کا علاج بھی ملتا ہے۔

98۔ تفسیر کبیر میں گزشتہ تہذیب اور تمدن کا ذکر ملتا ہے اور اس اصل کی طرف زور دیا گیا ہے کہ آئندہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد اسلام پر ہو گی۔

99۔ تفسیر کبیر میں جبر و قدر، جزاء و سزا اور نیکی وبدی کی تفصیلی بحث اسلام کی دی ہوئی روشنی کے مطابق ملتی ہے۔

100۔ تفسیر کبیر نے قرآن کریم کی وہ خدمت کی جس کی نظیر تواریخ اسلامی میں خال خال ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس تفسیر کے ایک ایک حرف کے بدلہ صاحبِ تفسیر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی، المصلح الموعود رضی اللہ عنہ و ارضاہ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

(روزنامہ الفضل آن لائن ایڈیشن مطبوعہ 15 نومبر 2022ء لندن)

مضامین کے لنکس

- قسط 1 ۔ ابتدائیہ جامع المناھج والاسالیب

https://www.alfazlonline.org/13/09/2022/68140/

- قسط 2 ۔ صرفی نحوی و لغوی منہج

https://www.alfazlonline.org/20/09/2022/68593/

- قسط 3 ۔ کلامی منہج / متکلمانہ رجحان

https://www.alfazlonline.org/27/09/2022/68965/

- قسط 4 ۔ مسلکی منہج / رجحان

https://www.alfazlonline.org/04/10/2022/69665/

- قسط 5 ۔ تحریکی منہج / رجحان

https://www.alfazlonline.org/11/10/2022/70187/

- قسط 6 ۔ فلسفیانہ منہج پر لکھی جانے والی تفاسیر

https://www.alfazlonline.org/18/10/2022/70623/

- قسط 7 ۔ اجتماعی منہج / رجحان

https://www.alfazlonline.org/25/10/2022/71094/

- قسط 8 ۔ تفسیر کبیر میں اجتماعی منہج کی چند مثالیں

https://www.alfazlonline.org/01/11/2022/71601/

- قسط 9 ۔ صناعت لفظی کا منہج / رجحان

https://www.alfazlonline.org/08/11/2022/72069/

- قسط 10 ۔ جامع منہج یا جامع رجحان

https://www.alfazlonline.org/15/11/2022/72562/



ادارہ الفضل آن لائن کی کتب

1. اسلامی اصطلاحات اسلامی اصطلاحات کا برمحل استعمال
2. ارشادات حضرت مسیح موعودؑ بابت مختلف ممالک و شہر
3. جماعت احمدیہ کے ذریعہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں خلافت خامسہ کا عظیم الشان کردار اور معیت الٰہی
4. ارشادات نور
5. کتاب تعلیم کی تیاری
6. ذیلی تنظیموں کا تعارف اور ان کے مقاصد

7. مجددین اسلام۔تعارف و کارہائے نمایاں
8. میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا
9. جماعت احمدیہ کا نظام خلافت
10. اداریے (حنیف محمود کے قلم سے) جلد اول
11. حیاتِ نور الدینؓ
12. دعا، ربوبیت اور عبودیت کا ایک کامل رشتہ ہے
13. قرآنی انبیاء
14. معلمین وقف جدید کے لئے مشعل راہ
15. جامع المناھج والاسالیب
16. اداریے جلد دوم (زیر تکمیل)
17. بچوں کی تقاریر از فرخ شاد (زیر تکمیل)
18. ہجری شمسی مہینوں کا تعارف (زیر تکمیل)

